فہرست

شذرات	یوم اقبال پر مدیر ''اشراق'' کا خطاب	جاوید احمد غامدی (مرتب: منظور الحسن)	۲
	یہ رقت آمیز اجتماعی دعائیں	ریحان احمد یوسفی	۶
قرآنیات	آل عمران (۳: ۴۵-۵۱)	جاوید احمد غامدی	۱۱
معارف نبوی	ایمان اور جنت	طالب محسن	۱۷
	نماز کے اوقات	ساجد حمید	۲۳
دین و دانش	قانون عبادات (۱۶)	جاوید احمد غامدی	۳۳
نقطۂ نظر	صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟	ساجد حمید	۳۹
تبصرۂ کتب	''قادیانیوں سے تعلقات کی شرعی حیثیت''	عمار خان ناصر	۶۳
اشاریہ	اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۴ء	معظم صفدر	۶۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی
مرتب: منظور الحسن

یوم اقبال پر مدیر ''اشراق'' کا خطاب

[یہ مدیر ''اشراق'' جناب جاوید احمد غامدی کا خطاب ہے۔ یہ خطاب انھوں نے ۹ نومبر ۲۰۰۴ کو ''مرکزیہ مجلس اقبال'' کی سالانہ تقریب کے موقع پر الحمرا ہال لاہور میں کیا۔ منظور الحسن صاحب نے اسے تحریر میں منتقل کیا ہے۔ ادارہ]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اقبال کی آواز اس عہد کی خوب صورت ترین آواز تھی۔ وہ ہمارا بے مثل شاعر، مفکر اور حکیم ہے۔ ہم نے اسے اگر شاعر مشرق کہا، ترجمان حقیقت کہا، حکیم الامت کہا تو بے جا نہیں کہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے قافلے آج بھی کہیں جادہ پیما ہوتے ہیں تو اقبال کی آواز ہی ان کے لیے بانگ درا بنتی ہے اور نوجوان آج بھی کہیں مائل پرواز ہوتے ہیں تو بال جبریل ہی سے اپنے لیے شہ پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اقبال کے بارے میں ان حقائق کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم اس کے اشعار گنگناتے ہیں، اس کی زندگی اور اس کے افکار کے بارے میں مقالے اور تقریریں سنتے ہیں، اس کی شان میں قصیدے کہتے ہیں اور اس کی یاد میں منعقد کی گئی ایسی ہی مجلسوں میں اسے بڑھ چڑھ کر خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ یوم اقبال کی اس تقریب میں اگر میں بھی اپنے الفاظ اسی طرح مدحت اقبال کی نذر کروں تو یہ کار بے خیر نہ ہو گا، مگر میرے خیال میں اس وقت جس موضوع کو سب سے بڑھ کر زیر بحث آنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اقبال کے بعد ہم کس جگہ کھڑے ہیں۔

پہلا مسئلہ جو اقبال کے بعد ہمیں درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے اس شاعر نے قومیت کا جو تصور پیش کیا ہے، کیا وہ زمینی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے یا ایسا آئیڈیل ہے جس تک کبھی رسائی نہیں ہو سکتی؟

ہم جانتے ہیں کہ اقبال ایک زمانے تک وطنیت کے نغمے گاتا رہا، لیکن پھر وہ وقت بھی آیا، جب اس نے پورے زور کے ساتھ مسلم قومیت کا تصور پیش کیا۔ اس نے لوگوں کو باور کرایا کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد رنگ، نسل یا وطن نہیں ہے، بلکہ خود اسلام ہے۔ اپنے مضامین، اپنی شاعری اور اپنے خطبات میں اس نے یہ مضمون، اگر میر انیس کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو فی الواقع

سورنگ سے باندھا ہے۔آپ کو اس کی نظم ''وطنیت بحیثیت سیاسی تصور'' کے یہ اشعار تو یاد ہوں گے۔اس نے کہا ہے:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

وہ اس معاملے میں اس انتہا تک چلا گیا کہ جب مولانا حسین احمد مدنی جیسے جلیل القدر عالم نے کسی موقع پر کہا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں تو اس نے سخت تنبیہ کے انداز میں فرمایا:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی ست

آج ہم سے ہماری نئی نسلیں یہ سوال کرتی ہیں کہ اقبال کا دیا ہوا مسلم قومیت کا یہ آفاقی تصور اگر درست ہے تو پھر مسلمان ممالک کی آپس کی سرحدوں کے کیا معنی ہیں؟ ہندوستان میں باقی رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کا کیا اسٹیٹس ہے؟ کیا وجہ ہے کہ مصور پاکستان کے پاکستان میں جب بنگلہ دیش اور افغانستان سے مہاجرین آئے تو انھیں اس ملک کے باشندے تصور کرنے سے انکار کر دیا گیا؟ کیا سبب ہے کہ آج ہماری قوم کی زبان پر یہ نعرہ جاری ہے کہ سب سے پہلے پاکستان؟

اقبال کے فرزند جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''اپنا گریباں چاک'' میں اپنے والد کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں انھوں نے اسی طرح کے زمینی حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے۔انھوں نے اپنے والد کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ جب آپ انگلستان گئے تھے اور میں نے آپ سے انگریزی باجا لانے کی فرمایش کی تھی تو میری یہ خواہش بھی آپ کے آسمانی افکار سے متصادم ہو گئی تھی اور آپ نے فرمایا تھا:

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

انھوں نے لکھا ہے کہ آج بھی کچھ اسی طرح کے زمینی حقائق اس امت کو درپیش ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔اس کے بعد انھوں نے ان نہایت اہم مسائل کی نشان دہی کی ہے جن سے اس وقت امت مسلمہ دوچار ہے۔اس امر کی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ضرورت تھی کہ ہمارے اہل دانش فرزند اقبال کی طرف سے نشان زد کیے گئے ان مسائل کی طرف متوجہ ہوتے، مگر افسوس ہے کہ نہ کسی نے اسے موضوع بنایا اور نہ اس کا کوئی نوٹس لیا اور ڈاکٹر صاحب بھی غالباً یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ اقبال اگر اب بھی ان کے خط کا جواب دیں تو غالباً یہی دیں گے:

نے افغانیم و نے ترک و تتاریم

چمن زادیم و از یک شاخساریم

بہر حال قومیت کے آفاقی تصور کے حوالے سے نظریے اور عمل کا جو تصادم پیدا ہو گیا ہے، وہ ہماری نئی نسل کے ذہن میں ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ یہ پہلا سوال ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا جو خواب دیکھا تھا، وہ اگرچہ بڑا خوب صورت اور دل نواز تھا، مگر اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جو لائحۂ عمل ہم نے آج تک اختیار کر رکھا ہے، کیا وہ درست ہے یا اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے؟

عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے ہم نے جو لائحۂ عمل اختیار کیا، اس کی ہمیشہ دو جہتیں رہی ہیں: ایک یہ کہ ہم نے ہر ممکن طریقے سے علما کو ایوان اقتدار میں پہنچا دینے کی کوشش کی اور دوسرے یہ کہ ہر موقع پر مسلمانوں کو جہاد و قتال کے ذریعے سے لڑ مرنے کی ترغیب دی۔ پہلی کاوش کے نتائج یہ ہیں کہ سعودی عرب میں محمد بن وہاب کی تحریک سے جو انقلاب برپا ہوا، اس نے بادشاہت کی صورت اختیار کی، ایران میں یہ تجربہ پاپائیت میں تبدیل ہو گیا اور افغانستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد ملائیت کی صورت میں ظہور پزیر ہوئی۔ چنانچہ اقبال ہی کے الفاظ میں مسلمان آج بھی اسی مخاطبت کے مستحق ہیں کہ ـــــــ اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری۔

جہاں تک دوسری کاوش کا تعلق ہے تو اس کے نتائج بھی آپ عراق سے لے کر افغانستان اور فلسطین سے لے کر چیچنیا تک، ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔

کیا اقبال نے بھی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے یہی لائحۂ عمل تجویز کیا تھا یا وہ اس سے مختلف تھا، اور اگر اس کا تجویز کردہ لائحۂ عمل یہی تھا تو پھر اس سے نکلنے والے نتائج ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں؟ یہ دوسرا سوال ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اقبال نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ شریعت کا جو ڈھانچا اس وقت موجود ہے، وہ نہ اسلام کی دعوت کے لیے موزوں ہے اور نہ اس کے نفاذ کے لیے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب Reconstruction of religious thought in islam میں اسے اصولی لحاظ سے موضوع بنایا۔ انھوں نے ان اہم عملی مسائل کی فہرست بندی بھی کی جن کا شریعت کے اس پیش کردہ ڈھانچے میں کوئی حل موجود نہیں ہے۔ یہ فہرست آج بھی اقبال میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال کی تشویش بالکل بجا تھی، مگر المیہ یہ ہے کہ اسے کسی نے لائق اعتنا ہی نہیں سمجھا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم شریعت اور اسے اخذ کرنے کے اصولوں کا پوری طرح جائزہ لیتے، تحقیق وجستجو کے مقامات کو متعین کرتے، اجتہاد کی راہوں کو دریافت کرتے اور اپنے لیے ایسی فقہ ترتیب دیتے جو ایک طرف قرآن وسنت کے عین مطابق ہوتی اور دوسری طرف دور جدید کے مسائل کو تشفی بخش طریقے سے حل کرتی، مگر ہم نے اس کے برعکس تقلید جامد کا رویہ اختیار کرتے ہوئے انھی قوانین سے چمٹے رہنے کا فیصلہ کیا جو ہمارے قدیم فقہا نے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے تشکیل دیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم نے اسلامی شریعت کے نام پر جو کچھ دعوت دی ہے اور جو کچھ نافذ کیا ہے، وہ اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اسے نہ اپنی قوم کے ذہین عناصر سے منوایا جا سکتا اور نہ دنیا کی غیر مسلم اقوام کے سامنے اعتماد سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارا یہ طرز عمل درست ہے یا اس معاملے میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ تیسرا سوال ہے۔

یہ وہ سوال ہیں جو ہمیں اس وقت امت کی سطح پر درپیش ہیں۔ میں مرکزیہ مجلس اقبال کو یہ توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ان مسائل کے بارے میں قوم کے ذہین عناصر کو متوجہ کرے۔ ان مسائل کی نوعیت محض افراد کی غلطیوں کی نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ اب ملت کے گناہ بن گئے ہیں اور اقبال کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

یہ رقت آمیز اجتماعی دعائیں

اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اعلیٰ ترین عمل ہے۔ دعا مانگنا توحید کا اعتراف اس سطح پر جا کر کرنا ہے جس سے زیادہ بلند سطح کا تصور بھی مشکل ہے۔ بندہ رب سے مانگ کر شرک سے اپنی بے زاری اور توحید پر ایمان کا عملی ثبوت دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس یقین اور اعتماد کا اظہار ہے کہ وہی ہر نفع ونقصان کا مالک ہے؛ وہ نفع ونقصان جس کی نسبت جب غیر اللہ کی طرف کی جاتی ہے تو شرک کی نت نئی اقسام وجود میں آجاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن وحدیث اللہ ہی سے مانگنے اور تنہا اسے ہی پکارنے کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں۔ اپنی اس اہمیت کی بنا پر دعا تمام انبیا اور صالحین کا وظیفہ رہی ہے۔ دیگر انبیا کی دعاؤں کا ذکر تو قرآن میں اختصار سے ہوا ہے، لیکن رسول اللہ کی دعاؤں کی جو تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں، ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک بندۂ مومن دعا کے ذریعے سے کس درجہ خدا سے قربت حاصل کر سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہمارے معاشرے میں جہاں دیگر بہت سے دینی امور میں افراط وتفریط کا رویہ عام ہو گیا ہے وہیں دعا جیسی عظیم عبادت میں بھی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے بہت دور آ گئے ہیں۔ خاص طور پر لمبی لمبی اجتماعی دعائیں، جن میں بے جا رقت در آتی ہے، آج کل بہت عام ہو چکی ہیں۔ ایسے اجتماعات میں حاضرین کی کثیر تعداد، خاص طور پر کی جانے والی رقت آمیز دعا میں شریک ہونے کے لیے دور دور سے آتی ہے، بلکہ اب تو ٹیلی وژن پر گھر بیٹھے ''رقت آمیز'' دعا سننے اور کرنے کا چلن بہت مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

بظاہر ان باتوں میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ دعا، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، اپنی ذات میں ایک انتہائی پاکیزہ اور اعلیٰ عبادت ہے۔ دین میں نہ اجتماعی دعا پر پابندی ہے نہ کسی خاص وقت یا عبادت کے موقع پر دعا کی حرمت وارد ہوئی ہے۔ اجتماعات کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال بھی غلط معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ایسے میں بعض مخلصین اور مقبولین بھی موجود ہوں گے۔ دعا کرانے والے افراد بالعموم بہت تیاری سے ڈھیر ساری دعائیں با اہتمام یاد کر کے آتے ہیں۔ اس لیے ان دعاؤں میں

جامعیت کا پہلو بھی ہوتا ہے اور الفاظ و اسالیب کا انتخاب بھی موثر اور دل پزیر ہوتا ہے۔ بلکہ بعض افراد تو اللہ میاں کو 'متاثر' کرنے کے لیے اچھے ادیبوں سے موثر اسالیب میں دعائیں لکھوا کر ساتھ لاتے ہیں۔ پھر رونے اور رلانے کی گارنٹی تو گویا وہ نسخہ ہے جس کے بعد دعا کی قبولیت کم و بیش یقینی ہو جاتی ہے۔

تاہم اجتماعی دعا کا جو طریقہ ہمارے ہاں رائج اور مقبول ہوتا جا رہا ہے، وہ اکثر و بیشتر دعا کی اس روح کو مجروح کر دیتا ہے جو قرآن و حدیث سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس راہ میں بعض ایسے خطرات پوشیدہ ہیں جن سے لوگوں کی غلط نفسیاتی اور ذہنی تربیت ہی نہیں ہوتی، بلکہ وہ غارت گر ایمان بھی ہو سکتے ہیں۔ تاہم ان کے بیان سے قبل ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا طریقہ لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس یاددہانی کے ساتھ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین دیا، اس پر عمل کا بہترین نمونہ بھی آپ خود قائم کر کے گئے ہیں۔

دعاؤں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ نماز جیسی اہم عبادت کے بعد بھی آپ اجتماعی دعا نہیں کرتے تھے۔ آپ کی زندگی میں متعدد رمضان اور شب قدر آئیں، مگر آپ نے کسی موقع پر لوگوں کو اکٹھا کر کے ''صلوٰۃ تسبیح'' اور اس کے بعد ''رقت آمیز'' دعا کا اہتمام نہیں کیا۔ حج جیسے عظیم اجتماع کے موقع پر بھی کوئی اجتماعی دعا آپ سے ثابت نہیں۔ اجتماعی دعا آپ کسی اجتماعی مسئلے کے موقع پر کراتے تھے۔ صلوٰۃ کسوف، خسوف، استسقاء، قنوت اور جمعہ کے خطبۂ آخر کے موقع پر کی جانے والی دعائیں اس کی مثالیں ہیں۔ اجتماعی دعا کے برخلاف آپ کی انفرادی زندگی سرتاسر دعا تھی۔ روزمرہ زندگی کا کوئی ایسا معمول نہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا منقول نہ ہو۔ ہر روز تہجد میں آپ کی نماز حمد، تسبیح، تلاوت کے علاوہ دعا ہی پر مشتمل ہوتی تھی۔ آپ کی رقت، خدا کے آگے زاری، اس کے حضور گڑگڑانے کی جو روایات ہمیں ملتی ہیں، وہ رسول اللہ کی انفرادی دعاؤں سے متعلق ہیں۔ آپ کی ذات چونکہ امت کے لیے ایک نمونۂ کامل ہے، اس لیے ازواج مطہرات اور دیگر صحابہ نے بڑے اہتمام سے ان انفرادی دعاؤں اور اذکار و معمولات کو امت تک منتقل کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اجتماعی دعا کی کمی اور انفرادی دعا کی کثرت کوئی ایسی راز کی بات نہیں۔ یہ قرآن کے اس حکم کی تعمیل ہے جس میں کہا گیا:

''اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ بے شک وہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

(الاعراف ۷:۵۵)

آپ کی پوری زندگی اسی کا نمونہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی طریقہ ہر مسلمان کے لیے نمونۂ کامل ہونا چاہیے۔ ایک مسلمان کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ دعا اگر قبول ہو گی تو اسی طریقے سے ہو گی کیونکہ جس سے دعا مانگی جاتی ہے اور جو دعا قبول کرتا ہے، اس نے تو یہی طریقہ سکھایا ہے۔

رہا ہمارے ہاں رائج اجتماعی دعا کا معاملہ تو اس کے بیان کردہ سارے فضائل، جن میں سے کچھ شروع میں ہم نے بیان بھی

کیے، قبولیت دعا کی شرط نہیں ہیں۔قرآن تو تنہا خدا کو پکارنے اور اسی کے حضور گڑگڑانے کی شرط لگاتا ہے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان گڑگڑاتا اس وقت ہے جب اس کا اپنا مسئلہ ہو۔کوئی انسان کسی دوسرے کے مسئلے کے لیے دعا تو کرسکتا ہے تڑپ کر خدا کو نہیں پکار سکتا۔ایک مصیبت زدہ انسان تنہائی میں بڑی بے کسی اور بے بسی سے خدا کو اپنا واحد سہارا سمجھ کر جب پکارتا ہے تو اس کی بات سننا خدا کی غیرت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔اس دعا کی قبولیت اتنی ہی یقینی ہوتی ہے کہ اس پر شک کرنا خدا کے وجود سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔اللہ تعالیٰ کبھی اس دعا کو بعینہٖ قبول کرتا ہے اور کبھی اپنی حکمت اور مصلحت کے پیش نظر دعا کے نتائج کسی ایسی شکل میں نکالتا ہے جو شاید داعی کی مرضی کے عین مطابق نہ ہو، لیکن اس کی بہتری میں ضرور ہوتے ہیں۔

اب ذرا ان مسائل کا ذکر ہو جائے جو اجتماعی دعا میں پوشیدہ ہیں۔ہم نے ابتدا میں بیان کیا ہے کہ دعا توحید کی اعلیٰ ترین سطح ہے، مگر اجتماعی دعا وہ بھی اگر رقت آمیز ہو جائے تو اس چیز کا شدید اندیشہ پیدا کر دیتی ہے کہ انسان تصنع، بناوٹ اور ریاکاری کا شکار ہو جائے۔ ریاکاری اپنی نوعیت کے اعتبار سے شرک ہے۔ چنانچہ توحید کے اظہار کے ساتھ شرک کے امکانات کو جمع کرنا عقل مندی نہیں۔ ہماری رقت آمیز دعاؤں میں داعی خود بھی روتا ہے اور لوگوں کو بھی رلاتا ہے۔لوگوں کو رلانا اصلاً وہ ''فن'' ہے جس کی مہارت پر داعی کی مقبولیت اور اجتماع کی کثرت کا انحصار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا پورا امکان رہتا ہے کہ داعی کے قلب کی ساری توجہ دل کا حال جاننے والے مالک کے بجائے خود رونے اور لوگوں کو رلانے پر رہے۔جس دعا میں دل کی حضوری نہ ہو، ساری توجہ الفاظ، اسالیب، سامعین پر ہو، اس کی قبولیت کے امکانات کتنے رہ جاتے ہیں، یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

اجتماعی دعا میں شریک ہونے والے لوگ نہ صرف خود ریاکاری کے خطرے کی زد میں رہتے ہیں، بلکہ دوسرے لوگوں کی موجودگی کے احساس کی بنا پر وہ بسا اوقات اس رقت سے محروم ہو جاتے ہیں جو تنہائی میں لازماً ظاہر ہوتی۔ کیونکہ حساس لوگ اسے ریاکاری خیال کرتے ہیں۔ جبکہ تنہائی میں نہ صرف یہ مسئلہ نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت طاری ہونے والی رقت اللہ تعالیٰ کی ایک غیر معمولی نعمت ہے۔تنہائی کی ہر عبادت کی طرح دعا کی بھی یہ خوبی ہے کہ خدا سے قربت کا وہ ذائقہ انسان کو نصیب ہوتا ہے جو اور کسی شے میں نہیں۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جسے شاعر نے بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اجتماعی دعا کا ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ بڑی طویل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تو کئی گھنٹے جاری رہتی ہے جس کے نتیجے میں سامعین کے ہاتھ دکھنے لگ جاتے ہیں۔ دعا کی طرف ان کی توجہ رہتی ہے نہ اس میں وہ کوئی رغبت محسوس کرتے ہیں۔ آدمی اگر تنہا ہو تو بے رغبتی کی صورت میں دعا ختم کرسکتا ہے، مگر اجتماعی دعا میں انسان بے زاری بھی محسوس کرتا ہے اور وہاں سے ہٹ بھی نہیں سکتا۔ بے حضوری اور بے زاری کی یہ کیفیت خدا سے قربت کے بجائے دوری پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اجتماعی دعا کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اس میں ''مزہ'' محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رونے کا عمل انسان کو بڑی حد تک ذہنی دباؤ وغیرہ سے دور کر دیتا ہے۔ جس کے بعد انسان خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ اسے اس رقت آمیز دعا میں سرور آنے لگتا ہے۔ اس قسم کا سرور مسلمانوں ہی کو نہیں غیر مسلموں کو بھی بتوں کے سامنے رونے دھونے میں محسوس ہو جاتا ہے۔ انسان اس سرور کو اپنی قبولیت کے آثار میں سے سمجھ لیتا ہے۔ پھر جس روز دعا میں اسے یہ 'سرور' نہ ملے، اس دن اسے دعا کی قبولیت کا امکان محسوس نہیں ہوتا۔ یہ واضح طور پر ایک غلط تصور ہے۔

ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ گناہوں میں مبتلا ایک عام انسان اس اجتماع میں داعی کی پیدا کردہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت کی بنا پر دعا کے وقت روتا ہے اور اس رونے کو اپنی معافی کی علامت سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ معافی کے لیے بنیادی شرط اپنی غلطی کو غلطی سمجھ کر نادم ہونا اور آیندہ اس سے بچنے کا عزم ہے۔ اس احساس اور عزم کے بغیر ''اجتماعی معافی'' پانے والے لوگ عملاً معصیت کی روش نہیں چھوڑتے۔ اس طرح کے لوگ ظاہری اعمال کے معاملے میں تو کچھ محتاط ہو جاتے ہیں، مگر حقوق العباد کے سلسلے میں انھیں گویا اب ایک لائسنس مل جاتا ہے کہ جتنا چاہیں خدا کے بندوں کے حقوق غصب کریں، خدا بہر حال ان پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ اس لیے کہ وہ اس کے خوف سے آنسو بہا کر جنت کا پروانہ پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں۔

ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح کی اجتماعی دعاؤں سے لوگوں کو یہ غلط تاثر ملتا ہے کہ دعا تو ایسے ہی بابرکت اجتماعات میں قبول ہو گی۔ کچھ خاص لوگ جو بہت مشہور ہو جاتے ہیں یا اپنی اعلیٰ تقریری صلاحیتوں کی بنا پر دعا میں بھی خطابت کے جوہر دکھا کر لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں، لوگوں کے لیے بے حد پرکشش ہو جاتے ہیں۔ لوگ ٹی وی پر یا اجتماعات میں با اہتمام ان کی دعاؤں میں شریک ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسے بابرکت اجتماع، رقت آمیز ماحول اور باکمال مقرر کی موجودگی میں دعا کی قبولیت، لوگوں کے خیال میں یقینی ہو جاتی ہے۔ جس سے دعا کی توحیدی روح سخت متاثر ہوتی ہے، کیونکہ اب مانگنے اور دینے والے کے بیچ میں ایک دلانے والا بھی آ جاتا ہے۔ یہ بات دعا ہی کے نہیں، دین کے فلسفے کے بھی خلاف ہے۔

ان سب مسائل کے ساتھ ہمیں یہ اندیشہ بھی ہے کہ کچھ عرصے میں یہ اجتماعی دعائیں بذات خود ایک مقدس دینی فریضہ بن جائیں گی۔ ان سے دور رہنے والے کو شقی و بدبخت سمجھا جائے گا۔ لوگ انھی اجتماعی دعاؤں پر قانع ہو کر بیٹھ جائیں گے اور انبیا اور صالحین کی وہ روایت ختم ہو جائے گی جس میں وہ سب سے کٹ کر اپنے رب کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہیں۔

ان سارے مسائل کی بنا پر اہل علم کے لیے لازم ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے صحیح بات رکھیں۔ انھیں بتائیں کہ دین کا اصل زور انفرادی دعا پر ہے۔ وہ انھیں انبیا اور صلحا کے طریقے سے دعا مانگنے کی تلقین کریں۔ انھیں بتائیں کہ دعا معاملات کی نوعیت کی چیز نہیں جس میں اجتہاد کی ضرورت پیش آ جائے، بلکہ یہ عبادات میں شامل ہے۔ اور عبادات میں اجتہاد نہیں تقلید واجب ہوتی ہے۔

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۱۱)

(گزشتہ سے پیوستہ)

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ: يَا مَرْيَمُ، إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ، وَجِيْهاً فِي الدُّنْيَا، وَالْاٰخِرَةِ، وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ

اِنھیں یاد دلاؤ، جب فرشتوں نے کہا: اے مریم، اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک فرمان کی بشارت دیتا ہے۔[۸۸] اس کا نام مسیح[۸۹] عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔[۹۰] وہ دنیا اور آخرت، دونوں میں صاحب وجاہت[۹۱] اور مقربین میں سے

[۸۸] سیدہ مریم کے لیے یہ بغیر کسی مرد کی ملاقات کے بچے کی پیدایش کی بشارت ہے۔ لیکن صرف لفظ فرمان کے ساتھ اس بشارت کی ابتدا اس لیے کی گئی ہے کہ معاملے کی نوعیت بھی ان پر واضح رہے، اور ایک کنواری اور شرم وحیا کی پیکر خاتون اس بات کو سننے کے لیے بھی تیار ہو جائے جو اسے کہنا پیش نظر ہے۔

[۸۹] یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ بنی اسرائیل کے یہاں روایت تھی کہ نبیوں اور بادشاہوں کو ان کے منصب پر مامور کرنے کا اعلان بالعموم ان کے سر پر ایک قسم کا مقدس تیل مل کر کیا جاتا تھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ اعلان ان کی پیدایش کے فوراً بعد گہوارے ہی میں گویا براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ چنانچہ مسیح کا یہ لقب انھی کے لیے خاص ہو گیا۔ انجیل میں اسی بنا پر انھیں ''خداوند کا مسیح'' کہا گیا ہے۔

[۹۰] یعنی وہ کسی باپ کا بیٹا نہیں ہوگا۔ استاذ امام کے الفاظ میں سیدنا مسیح علیہ السلام کو ابن مریم کہہ کر یہ قرآن نے ان

ہوگا، (اپنی نبوت کا کلام) لوگوں سے گہوارے میں بھی کرے گا[92] اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی،[93] اور صالحین میں شمار

لوگوں کے لیے گفتگو کی ہر گنجایش ختم کر دی ہے جو کمزور تاویلات کے ذریعے سے قرآن کے نہایت واضح نصوص میں تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''...اگر حضرت عیسیٰ کسی باپ کے بیٹے تھے تو آخر قرآن کو مسیح بن مریم کہنے کے بجائے ان کے باپ کی طرف ان کی نسبت کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟ قرآن بھی مسیح بن یوسف کہہ سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ آخر کیوں نہیں کہا؟''

(تدبر قرآن ۲/ ۹۳)

[۹۱] یہ وہی وجاہت ہے جس کا ذکر اس سے پہلے سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے بیان میں ہو چکا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

''لوقا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مسیح نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی، لیکن اس کم سنی کے باوجود ان کی تعلیم کی حکمت و معرفت، کلام کی بلاغت و جزالت اور لب و لہجہ کی عظمت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہ اور فریسی، سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اس شکوہ سے بات کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے اس کو اختیار ملا ہوا ہے۔ یہود یہ کی بستیوں میں جب انھوں نے تبلیغ شروع کی تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی۔ خلقت ان پر ٹوٹ پڑتی تھی۔ فقیہ اور فریسی سب پر ایک سراسیمگی کا عالم تھا، وہ ان کو زچ کرنے اور عوام میں ان کی مقبولیت کم کرنے کے لیے ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے، لیکن سیدنا مسیح دو دو لفظوں میں ان کو ایسے دنداں شکن جواب دیتے تھے کہ پھر ان کو زبان کھولنے کی جرات نہ ہوتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی وجاہت کا یہ غلغلہ ہوا کہ عوام ان کو اسرائیل کا بادشاہ کہنے اور ان کی بادشاہی کے گیت گانے لگے، یہاں تک کہ رومی حکام ـــــ ہیرودیس اور پیلاطوس ـــــ کے سامنے بھی یہ مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ کی حیثیت سے آ گیا، لیکن وہ بھی اپنی تمام قوت و جبروت کے باوجود سیدنا مسیح کی عظمت و صداقت اور ان کی بے پناہ مقبولیت سے مرعوب ہو گئے۔

اس وجاہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ باوجودیکہ سیدنا مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے اور بن باپ کے پیدا ہونے والے کسی بچے کے لیے عام حالات میں کسی عزت و وجاہت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن سیدنا مسیح چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمۂ 'کن' سے پیدا ہوئے تھے اس وجہ سے اس کا معجزانہ اثر یہ ظاہر ہوا کہ روز اول سے ان کو خلق کی نگاہوں میں وہ وجاہت حاصل رہی جو اس عہد میں کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ زندگی بھر اپنے جانی دشمنوں میں گھرے رہے، لیکن اس پہلو سے کسی کو ان پر طعن کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔ یہود کے ایک گروہ نے اگر جسارت بھی کی تو بعد کے زمانوں میں کی، ان کے عہد مبارک میں کسی کو بھی اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ، قَالَ: كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ، إِذَا قَضٰىٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ: كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٤٧﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَالتَّوْرٰةَ وَالْإِنْجِيْلَ ﴿٤٨﴾ وَرَسُوْلًا إِلٰى بَنِىٓ إِسْرَآءِيْلَ، أَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ:

کیا جائے گا۔ وہ بولی: پروردگار، میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ فرمایا: اِسی طرح اللہ جو چاہے، پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی معاملے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا، پھر وہ ہو جاتا ہے۔[۹۴] (چنانچہ اِسی طرح ہوگا اور) اللہ اُسے قانون اور حکمت سکھائے گا، یعنی تورات وانجیل کی تعلیم دے گا[۹۵] اور اِس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔[۹۶] (چنانچہ یہی ہوا اور اُس نے بنی اسرائیل کو

قسم کی جرات نہ ہوسکی۔ ان کی اس وجاہت کی بشارت ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریم کو اس لیے دی گئی کہ ان کو اس پہلو سے کوئی خلجان نہ ہو کہ بن باپ کے پیدا ہونے کے سبب سے بچے کی یا خود ان کی وجاہت پر کوئی اثر پڑے گا۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے ان تمام خرافات کی تردید ہو رہی ہے جو انجیلوں میں مذکور ہیں کہ یہودیوں نے سیدنا مسیح کے نعوذ باللہ طمانچے لگائے، ان کا مذاق اڑایا، ان کو گالیاں دیں، ان کے منہ پر تھوکا۔ ان خرافات کا اکثر حصہ، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے، غلط ہے۔ اللہ کے رسولوں کے دشمن ان کی توہین وتحقیر کی جسارت تو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل بھی مل جاتی ہے، لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، جب کوئی قوم اس حد سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور اس ناہنجار قوم کا بیڑا غرق کر دیا جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۹۲)

[۹۲] مسیح علیہ السلام کے معاملے میں یہ غیر معمولی واقعہ اس لیے ہوا کہ سیدہ مریم پر کسی تہمت کی گنجایش نہ رہے اور انھیں یہ بشارت اسی موقع پر اس لیے دی گئی کہ وہ مطمئن ہو جائیں کہ لوگوں کے ان کے خلاف زبان کھولنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ ایک ایسی زبان ان کے حق میں کھول دے گا جو سب کی زبانیں بند کر دے گی۔

[۹۳] یعنی اس کے بعد وہ بڑی عمر کو پہنچے گا اور نبوت کا یہی کلام اپنی قوم سے کرے گا۔

[۹۴] یہ اس فرمان کی وضاحت ہے جس سے سیدنا مسیح علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔

[۹۵] اس سے تورات وانجیل کا باہمی تعلق بھی قرآن نے بتا دیا ہے اور یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ انجیل ایمان و اخلاق کے انھی حقائق کو بے نقاب کرنے کے لیے نازل کی گئی تھی جنھیں بنی اسرائیل فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس سے مقصود

أَنِّيٓ أَخۡلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـَٔةِ الطَّيۡرِ، فَأَنۡفُخُ فِيۡهِ، فَيَكُوۡنُ طَيۡرًا بِإِذۡنِ اللّٰهِ، وَأُبۡرِئُ الۡأَكۡمَهَ وَالۡأَبۡرَصَ، وَأُحۡيِ الۡمَوۡتٰى بِإِذۡنِ اللّٰهِ، وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأۡكُلُوۡنَ، وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ فِيۡ بُيُوۡتِكُمۡ. إِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمۡ، إِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۹﴾

دعوت دی کہ[۹۷]) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں[۹۸]۔ وہ یہ کہ میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے کی ایک صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونکتا ہوں تو اللہ کے حکم سے وہ فی الواقع پرندہ بن جاتی ہے؛ اور اندھے اور کوڑھی کو میں اللہ کے حکم سے اچھا کرتا ہوں؛ اور مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں؛ اور میں تمھیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو۔ اِس میں تمھارے لیے یقیناً ایک

تورات کے احکام میں کوئی تغیر و تبدل کرنا نہیں تھا، بلکہ انھی کو پورا کرنا تھا تاکہ ان کی روح اور ان کی حکمت ہر لحاظ سے نمایاں ہو اور خدا کی شریعت لوگوں کے لیے زندگی سے خالی محض ایک بوجھ بن کر نہ رہ جائے۔

[۹۶] اصل میں 'رسولا الی بنی اسرائیل' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یعنی 'یبعثہ رسولا'۔ سیدنا مسیح علیہ السلام حضرت یحییٰ کی طرح صرف ایک نبی نہیں تھے، بلکہ اس کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ آیت سے واضح ہے کہ ان کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے خاص تھی اور اس کے ماننے یا جھٹلانے کے نتائج بھی دنیا میں انھی کو بھگتنا تھے۔ چنانچہ ان پر ایمان لانے کے بجائے بنی اسرائیل جب ان کے قتل کے درپے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں سے متعلق اپنے قانون کے مطابق ان کے اس جرم کی یہ سزا ان پر نافذ کر دی کہ اب وہ قیامت تک کے لیے مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کے محکوم بن کر دنیا میں رہیں گے۔

[۹۷] سیدنا مسیح علیہ السلام کی سرگزشت کا ایک بڑا حصہ اپنے اسلوب کے مطابق حذف کر کے یہ قرآن نے گویا انھیں ایک داعی کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے کھڑا کر دیا ہے کہ انھوں نے اس طریقے سے اپنی دعوت انھیں پیش کی اور اس کے لیے یہ معجزات انھیں دکھائے۔

[۹۸] اصل میں 'جئتکم بآیۃ' کے الفاظ آئے ہیں۔ لفظ 'آیۃ' کی تنکیر ان میں وحدت کے لیے نہیں، بلکہ تعمیم کے لیے ہے۔ یعنی میں اپنے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ ایک ہی صورت میں سامنے آئے یا ایک سے زیادہ صورتوں میں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ، وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ، وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ، فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۵۰﴾ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ، هَـٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿۵۰﴾

بڑی نشانی ہے، اگر تم ماننے والے ہو۔ اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں[99] جو مجھ سے پہلے آ چکی ہے، اور اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال ٹھیراؤں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں[100]، اور (دیکھو) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ سو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ یقیناً اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی[101]، لہٰذا تم اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ ۴۵۔۵۱

---

[۹۹] اصل الفاظ ہیں: 'مصدقا لما بین یدی من التوراۃ'۔ ان میں 'مصدقا' حال ہے جو 'انی قد جئتکم بآیۃ' کے جملے پر آیا ہے اور محض مشابہت کی وجہ سے پچھلے جملے پر عطف ہو گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ میں تورات کی تردید کرنے نہیں، بلکہ اسی کو قائم کرنے اور اس کی ان پیشین گوئیوں کو سچا کر دینے کے لیے آیا ہوں جو آنے والے نبیوں کے بارے میں تم اس میں پڑھتے رہے ہو۔

[۱۰۰] یعنی تمھارے علما کے غلو اور اس کے نتیجے میں ان کی طرف سے صادر ہونے والے من گھڑت فتووں کی وجہ سے حرام کر دی گئی ہیں۔

[۱۰۱] انجیل میں اللہ تعالیٰ کے لیے میرا باپ اور تمھارا باپ کی جو تعبیر جگہ جگہ آئی ہے، یہ قرآن نے اس کی تصحیح کر دی ہے کہ سیدنا مسیح نے جو بات فرمائی تھی، وہ درحقیقت یہ تھی، لیکن عبرانی زبان میں اب اور ابن کے الفاظ چونکہ باپ اور بیٹے اور رب اور بندے کے معنی میں مشترک تھے، اس لیے نصاریٰ نے سیدنا مسیح کی الوہیت کا عقیدہ ایجاد کیا تو اس اشتراک سے فائدہ اٹھا کر انھیں یہ صورت دے دی۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

طالب محسن

ایمان اور جنت

[مسلم، کتاب الایمان ۱۳]

حدثنی أبو أیوب أن أعرابیا عرض لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو فی سفر. فأخذ بخطام ناقتہ أو بزمامھا . ثم قال: یارسول اللّٰہ أو یا محمد، أخبرنی بما یقربنی من الجنۃ وما یباعدنی من النار . قال: فکف النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم . ثم نظر فی أصحابہ . ثم قال: لقد وفق أو لقد ھدی . قال: کیف قلت؟ قال: فأعاد. فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم تعبد اللّٰہ لا تشرک بہ شیئا وتقیم الصلاۃ وتؤتی الزکاۃ وتصل الرحم. دع الناقۃ.

''حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کر رہے تھے کہ ایک دیہاتی آپ کے پاس آیا۔اس نے آپ کی اونٹنی کی نکیل یا لگام پکڑ لی۔ پھر بولا: یارسول اللہ، یا یا محمد، مجھے وہ چیز بتائیے جو مجھے جنت کے قریب کرتی ہو اور جہنم سے دور کرتی ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے پھر آپ نے صحابہ کی طرف دیکھا۔قدرے توقف کے بعد (غالباً یہ) کہا کہ اسے (صحیح بات) کی توفیق دی گئی ہے یا (یہ) فرمایا کہ اسے ہدایت دی گئی ہے اور اس سے کہا: تم کیا کہہ رہے تھے؟ اس نے (اپنا سوال) دہرایا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائے۔ نماز کا اہتمام کرے۔ زکوٰۃ ادا کرے۔ اور صلہ رحمی کرے۔ ناقہ کو چھوڑ دو۔"

لغوی مباحث

خطام أو زمام: ہم نے ایک لفظ کا ترجمہ نکیل کیا ہے اور دوسرے کا ترجمہ لگام کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مسلم کے شارح نووی نے ان کے فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: خطام وہ چیز ہے جس سے اونٹ کو (ہانکنے کے لیے) باندھا جاتا ہے۔ یعنی کھجور کی چھال، یا بالوں، یا السی کی رسی لی جاتی ہے۔ اس رسی کے ایک سرے پر ایک حلقہ بنایا جاتا ہے، اس حلقے سے دوسرا سرا گزار کر ایک بڑا حلقہ بنا لیتے ہیں۔ اس سے اونٹ کو قلادہ ڈال دیتے ہیں۔ پھر اسے اس کے ناک پر دو بار لپیٹ دیتے ہیں۔ یہاں ایک چمڑے کی پٹی ہوتی ہے جسے جریر کہتے ہیں۔ جو چیز اونٹ کی ناک میں کس کر ڈالی جاتی ہے، وہ زمام ہے۔

وفق أو هدی: راوی نے حضور کے جملے کے بارے میں تردد ظاہر کیا ہے۔ یعنی حضور نے 'وفق' بولا ہے یا 'هدی' کہا ہے۔ 'وفق' کا مطلب ہے توفیق دیا گیا۔ توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کے معاملے میں پیدا کردہ سازگاری ہے۔ 'هدی' کا مطلب ہے رہنمائی دیا گیا۔ یہاں اس سے مراد ہے: صحیح بات سجھائی گئی۔

تعبد اللّٰه: اس کا لفظی ترجمہ ہوگا: تو عبادت کرتا ہے۔ لیکن یہ خبر امر کے معنی میں ہے۔ ہمارا ترجمہ اسی توجیہ کے مطابق ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مصدر کے محل پر فعل استعمال ہوگیا ہے۔ گویا جملہ یہ ہے: 'هو عبادتك اللّٰه'۔ اس کی مثال قرآن مجید میں بھی ہے: 'ومن آیاته یریکم البرق' (الروم ۳۰: ۲۴)۔

تصل الرحم: صلہ رحمی عربی محاورہ ہے۔ اس سے رشتہ داروں سے تعلق قائم رکھنا اور ان کے حقوق ادا کرتے رہنا مراد ہے۔

معنی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے سوال کو خوب سراہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل دعوت یہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں کی دعوت کا مرکزی نکتہ آخرت کی یاددہانی ہے۔ روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کو بہت اچھے طریقے سے واضح تھی۔ اس بات کا ایک مظہر یہ روایت بھی ہے۔ یہ ایک دیہاتی مسلمان ہے، جو غالباً پہلی دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مل رہا ہے۔ لیکن اس کے سوال سے واضح ہے کہ اس کا نمایاں ترین مسئلہ اخروی فلاح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اسے نہ صرف یہ کہ صحیح سوال کرنے پر داد دی، بلکہ صحابہ کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کے جواب میں چار باتوں کا ذکر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں دوسری بعض روایات کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طرح حج اور روزے کا ذکر کیوں نہیں ہے۔اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس روایت کے دوسرے متون میں ان کا ذکر بھی ہے۔لیکن ان میں صلہ رحمی کا ذکر نہیں ہے۔یعنی ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کا ذکر کیا ہو اور بعض راویوں نے کچھ بیان کر دیے اور بعض نے کچھ دوسرے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی باتوں کا ذکر کیا ہو جو اس روایت میں آئی ہیں۔لیکن راویوں نے اپنے فہم سے کسی روایت میں کچھ چیزیں ڈال دیں اور کچھ نکال دیں۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ روایات میں مضمون میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔

اس روایت کی ایک اہم بات یقینی نجات کا بیان ہے۔قرآن مجید میں جیسا کہ سورۂ عصر سے واضح ہے، یقینی نجات کے لیے ایمانیات کی صحت، تمام اعمال صالحہ اور اپنے ماحول میں نیکی کی تلقین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔لیکن قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر سیاق وسباق کے مطابق کہیں ایک چیز اور کہیں دوسری کا ذکر کیا گیا ہے۔مثلاً سورۂ کہف کی آیت (۱۱۰) 'فمن كان يرجوا لقاء ربه فليعمل عملا صالحا و لا يشرك بعبادة ربه أحدا' میں تواصی کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی حیثیت بنیادی عنوانات کی ہے۔ روایات اور قرآن مجید میں مختلف مقامات پر انھی میں سے کسی چیز کو نمایاں کرنے کے لیے اس کا ذکر الگ کر دیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس نوع کی تمام روایات میں مخاطب کی رعایت سے یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔

اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بھی ایک دل پذیر پہلو سامنے آتا ہے۔سائل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری روکی۔لیکن آپ نے کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی۔ سوال کیا تو اس میں موجود خوبی کی پوری طرح داد دی۔ جب بات مکمل ہوئی تو محض اتنا کہا: ناقہ کو چھوڑ دو۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے یہی پہلو ہیں جن کی بنا پر آپ کو صحابہ کی غیر معمولی عقیدت اور محبت حاصل ہوئی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متون

مسلم کی اگلی روایت بھی اسی روایت کا ایک متن ہے۔اس کے حوالے سے ہم آگے بات کریں گے۔اس روایت کے بعض متون میں یہ راستے میں روکنے کا ذکر نہیں ہے۔ روایت براہ راست سوال اور اس کے جواب پر مشتمل ہے۔بعض روایات میں نماز کے ساتھ مفروضہ اور مکتوبہ کا اضافہ بھی ہے۔بعض روایات میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روکنے پر لوگوں کے اظہار تعجب کا بیان بھی موجود ہے۔ایک روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ یہی سائل حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ملاقات کا احوال بیان کر رہا تھا۔لیکن اس روایت میں توحید کا ذکر نہیں ہے اور آخری حصہ میں یہ بات بیان کی ہے کہ رسول اللہ نے یہ بھی کہا: دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو اور وہی ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو۔بعض روایات میں 'لا ازيد على هذا و لا أنقص' کا جملہ بھی روایت ہوا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا گیا ہے

کہ اگر کسی کو کوئی جنتی دیکھنا ہو تو اسے دیکھے۔ ان کے علاوہ کچھ لفظی فرق بھی ہیں۔

کتابیات

بخاری، رقم ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۵۶۳۷۔ مسلم، رقم ۱۳، ۱۴۔ نسائی، رقم ۴۶۸۔ احمد، رقم ۸۴۹۶، ۲۵۹۲۶، ۲۳۵۸۵، ۲۳۵۹۶۔ ابن حبان، رقم ۴۳۷، ۳۲۴۵، ۲۳۴۶۔ السنن الکبریٰ، رقم ۳۲۸، ۵۸۸۰۔ بیہقی، رقم ۷۰۲۹۔ المعجم الکبیر، رقم ۳۴۴۳، ۳۹۲۴، ۳۹۲۵، ۳۹۲۶، ۵۴۷۸، ۷۲۸۴۔

— ۱۴ —

عن أبی أیوب قال جاء رجل الی النبی صلی اللّٰه علیه و سلم . فقال: دلنی علی عمل أعمله یدنینی من الجنة و یباعدنی من النار . قال: تعبد اللّٰه لا تشرك به شیئا و تقیم الصلوٰة و تؤتی الزکوٰة و تصل ذا رحمك . فلما أدبر قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم: ان تمسك بما أمر به دخل الجنة.

''حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: مجھے ایسا عمل بتائیے جسے میں کروں تو وہ مجھے جنت سے قریب کر دے اور جہنم سے دور کر دے۔ آپ نے فرمایا: تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، نماز کا اہتمام رکھے، زکوٰۃ ادا کرے اور صلہ رحمی کرے۔ یہ سن کر جب وہ آدمی لوٹ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اس نے اس بات کو پکڑ لیا جو اسے کہی گئی ہے تو جنت میں چلا گیا۔''

لغوی مباحث

تعبد اللّٰه: مضارع کے امر کے محل پر استعمال کی پچھلی روایت میں وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ اسلوب امر کے مقابلے میں

زیادہ بلیغ ہے۔

ذا رحـــمك :اس کے بارے میں نووی میں سوال اٹھایا ہے کہ 'ذو' کی اضافت واحد کی طرف خلاف قاعدہ ہے۔مگر یہ بیان کر دیا ہے کہ یہ جائز ہے۔

— ۱۵ —

عن أبی هریرة رضی الله عنه أن أعرابیا جاء إلی رسول الله صلی الله علیه وسلم. فقال: یا رسول الله دلنی علی عمل إذا عملته دخلت الجنة. قال:تعبد الله ولا تشرك به شیئا وتقیم الصلاة المکتوبة وتؤدی الزکوٰة المفروضة وتصوم رمضان قال: والذی نفسی بیده لا أزید علی هذا شیئا أبدا ولا أنقص منه. فلما ولی، قال النبی صلی الله علیه وسلم من سره أن ینظر الی رجل من أهل الجنة فلینظر الی هذا.

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: یارسول اللہ، مجھے اس عمل کی رہنمائی فرمائیے، جسے میں کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔آپ نے فرمایا: تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔واجب نماز کا اہتمام رکھے،فرض زکوٰۃ ادا کرتا رہے اور رمضان کے روزے رکھے۔اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نہ اس پر کوئی اضافہ کروں گا اور نہ اس میں کوئی کمی کروں گا۔جب وہ شخص واپس چلا گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جسے یہ بات بھاتی ہو کہ وہ اہل جنت میں سے ایک آدمی کو دیکھے تو وہ اسے دیکھ لے۔''

معنی

روایات (۱۴،۱۵) اوپر مذکور روایت (۱۳) ہی کے دوسرے متن ہیں۔اس متن سے متعلق اہم مباحث اوپر زیر بحث آ چکے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہیں۔

متون

متون کے اختلافات بھی ان سے پہلے کی روایت کے تحت زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہاں ہم ایک روایت کو نقل کرنے پر کفایت کریں گے جو سائل کے اپنے الفاظ میں الآحاد والمثانی کے مصنف نے روایت کی ہے:

لقيت رسول الله صلى الله عليه وسلم بين عرفة والمزدلفة. فأخذت بخطام ناقته. فقلت ما ذا يقربني من الجنة ويباعدني من النار. قال: أما والله لئن كنت أوجرت في المسئلة لقد أعظمت وأطولت، أقم الصلوٰة المكتوبة وأد الزكوٰة المفروضة وحج البيت وما أحببت أن يفعله بك الناس. فافعل بهم. وما تكره أن يأتي الناس إليك فدع الناس. خل سبيل الناقة. (رقم ۱۲۵۹)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے عرفہ اور مزدلفہ کے مابین ملاقات کی۔ میں نے حضور کی اونٹنی کی لگام پکڑ لی اور آپ سے پوچھا: کیا (چیز) مجھے جنت کے قریب اور آگ سے دور کرے گی؟ آپ نے فرمایا: بخدا، اگر تمھیں سوال کرنے پر اجر دیا جاتا تو تمھیں بہت بڑا اجر دیا جاتا۔ فرض نماز کا اہتمام رکھو، واجب زکوٰۃ ادا کرو، بیت اللہ کا حج کرو اور جو تم پسند کرتے ہو کہ لوگ تمھارے ساتھ کریں، وہ لوگوں کے ساتھ کرو، جو تم ناپسند کرتے ہو کہ لوگ تمھارے سامنے لے کر آئیں تو لوگوں کے معاملے میں اسے چھوڑ دو۔ اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

صاحب فتح الملہم نے اس راوی کے نام کے بارے میں درج ذیل نوٹ لکھا ہے:

''یہ قیس کا ایک آدمی ہے جسے ابن منتفق کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ بغوی اور طبرانی کی ایک روایت میں تصریح کی گئی ہے۔ صیرفی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس ابن منتفق کا نام لقیط بن صبرہ ہے اور یہ بنی منتفق کی طرف سے حضور سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ طبرانی میں یہی سوال صخر بن قعقاع باہلی کے حوالے سے بھی نقل ہوا ہے۔'' (۱/۱۷۷)

کتابیات

یہ روایت اوپر مذکور حوالوں کے علاوہ دیگر کتب میں بھی آئی ہے۔ دیکھیے: الآحاد والمثانی، رقم ۱۲۵۹، ۱۶۹۶۔ مسند احمد، رقم ۱۵۲۹۲۶۔ المعجم الاوسط، رقم ۸۲۴۴۔

ساجد حمید

شرح موطا امام مالک

باب وقوت الصلوٰۃ

نماز کے اوقات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[۴] وحدثنی یحیی عن مالك عن یحیی بن سعید عن عمرة بنت عبد الرحمن عن عائشة زوج النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم انها قالت :

اِنْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُصَلِّى الصُّبْحَ، فَيَنْصَرِفُ النِّسَاءُ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ مَا يُعْرَفْنَ مِنَ الْغَلَسِ.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھاتے ، (نماز پڑھنے کے بعد) عورتیں چادریں اوڑھے ہوئے جب لوٹتیں تو اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔

شرح

مفہوم و مدعا

اس روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فجر کا معمول یہ تھا کہ آپ فجر کی نماز اندھیرے ہی میں ادا کر لیتے تھے۔ نماز

سے فراغت کے بعد بھی اندھیرا اس قدر رہوتا کہ عورتوں کا باہم پہچان لینا آسان نہیں تھا۔لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ فجر کا وقت ہوتے ہی نماز ادا کر لیتے تھے۔ بلکہ آپ کا عمل یہ تھا کہ آپ اتنی تاخیر کرتے کہ گھپ اندھیرا نہ ہو۔جیسا کہ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، اسے ہم آگے چل کر درایت کی فصل میں تفصیل سے دیکھیں گے۔

ہماری مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین بتانے میں ایک متوازن اور معتدل رویہ اختیار کرتے تھے، وہ ایسا طریقہ کبھی اختیار نہیں کر سکتے تھے، جو عامۃ المسلمین کے لیے تکلیف دہ ہو۔آپ نے نماز میں تعجیل ضرور کی ہے، مگر آپ نے عام نمازی کا بھی خیال رکھا۔اس لیے ہمارے خیال میں فجر کی نماز میں آپ کا معمول یہ تھا کہ نہ بہت جلدی پڑھتے اور نہ بہت تاخیر کرتے۔آپ کی نماز یقیناً اندھیرے میں شروع ہوتی، لیکن فجر کے طلوع ہوتے ہی نماز کھڑی نہیں کر دی جاتی تھی۔ بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ آپ اندھیرے کے آخری لمحات میں فجر ادا کرتے۔

یعنی آپ کا وقت ایسا رہا کہ غلس کے آخری اور اسفار کے ابتدائی وقت میں آپ نماز پڑھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اگر آپ لمبی قرأت کرتے تو اجالا ہو جاتا اور اگر قدرے کم قرأت کرتے تو اندھیرے ہی میں نماز سے فارغ ہو جاتے۔ ہمارے خیال میں اس روایت کا یہی مدعا ہے جو اس باب کی تمام روایتوں کو قابل فہم بناتا ہے۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر میں خواتین بھی شرکت کرتی تھیں، اور وہ چادریں اوڑھ کر آتی تھیں۔یہ مسلم معاشرت کا ایک پہلو ہے کہ خواتین بھی نیکی کے اجتماعی کاموں میں شریک ہوں تاکہ وہ اسلام، اس کے پیغام اور اس کے اعمال سے آگاہ رہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لغوی مسائل

إن کان... لیصلی میں 'إن' ثقیلہ سے مخففہ ہے، اس کا اسم 'ضمیر شان' محذوف ہے اور 'لیصلی' پر لگا لام مفتوح 'إن' نافیہ اور 'إن' مخففہ میں فرق کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔البتہ کوفیوں کی رائے میں یہ 'إن' نافیہ ہے، اور 'لیصلی' کا لام اِلَّا کے معنی میں آتا ہے۔

متلفعات: لپیٹنے، پہننے اور ڈھانپنے کے لیے بولا جاتا ہے۔کعب بن زہیر کا مصرع ہے:

وقد تلفع بالقور العساقیلُ

''سراب ٹیلوں سے ڈھک گئے۔''

عرفہ کے خطبہ کے موقع پر آپ کے بارے میں آتا ہے کہ 'علیہ برد متلفع بھا'۔یعنی آپ ایک چادر میں ملبوس تھے، جسے آپ نے لپیٹ رکھا تھا۔یعنی جس طرح حاجی لپیٹتے ہیں۔یا جیسے ام سلمی کے گھر میں آپ کی نماز کا ذکر یوں ہوا ہے: 'یصلی فی ثوب متلفعا'، وہ ایک کپڑے میں ملبوس نماز پڑھ رہے تھے۔

لپیٹنے کے معنی میں اس کی ہیئت متعین معلوم نہیں ہوتی۔کبھی جسم کا کوئی حصہ اور کبھی پورا جسم، ڈھانپنے کا مفہوم قرائن سے

متعین ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ کبھی ہیئت کی توضیح کر دی جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ یعنی اگر ہیئت نہ بتائی گئی ہو تو سب صورتیں لپیٹنے کی مراد ہو سکتی ہیں، اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ سر بھی ڈھانپا گیا ہو۔

زیر بحث حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ 'متلفعات بمروطھن ما یعرفن من الغلس' وہ چادروں میں لپٹی ہوئی نکلتیں کہ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتیں۔ یوں لپٹے ہونے سے یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چادریں لپیٹنے کی وجہ سے وہ پہچانی نہیں جا رہی تھیں یا کہ غلس (تاریکی) کی وجہ سے؟ حدیث کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ پہچاننے میں رکاوٹ چادریں نہیں، بلکہ تاریکی تھی۔

چنانچہ 'متلفعات' کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ چادریں اسی طرح لپیٹے ہوئے تھیں جس طرح اوپر ج والی صورت کا ذکر ہوا ہے، یا بس بکل ماری ہوئی تھی، اور سر اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ اس میں سر ڈھانپے ہونے کے معنی بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے شارحین نے بالعموم اس کے معنی یہی لیے ہیں کہ انھوں نے یہ چادریں سر پر بھی اوڑھ رکھی تھیں۔

اس معنی میں لے کر ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ حضرت عائشہ کی غالباً مراد یہ ہو کہ روشنی اتنی ہوتی تھی کہ اگر وہ چادریں اوڑھ کر ادنائے جلباب نہ کیے ہوتیں (گھونگھٹ نہ نکالے ہوتیں) تو پہچانی جاتیں۔ چونکہ اس وقت فضا میں روشنی زیادہ نہ ہوتی تھی اس کی وجہ سے گھونگھٹ کے نیچے تاریکی بڑھ جاتی اور وہ پہچانی نہ جاتی تھیں۔ اس معنی میں اس جملے کو لینے میں کوئی مانع نہیں ہے اور میرے خیال میں اسفار والی روایتوں سے اس کے اختلاف کو دور کرنے میں یہ معنی زیادہ معاون ہیں۔

ایک طریقے میں 'متلفعات' کو نماز پڑھنے سے متعلق کیا گیا ہے کہ وہ نماز چادریں اوڑھ کر پڑھتی تھیں۔ پھر یہ سوال قائم نہیں رہتا کہ وہ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی مشکل تھیں یا چادروں کی وجہ سے۔ لیکن زیادہ تر طرق میں موطا کے الفاظ ہی کی تائید ہوتی ہے۔

مروط: مرط کی جمع ہے۔ اس کے معنی موٹی اور دبیز چادر کے ہوتے ہیں، جو اون یا ریشم کی بنی ہوتی ہے۔ یہ ان سلی ہوتی تھی۔ اس کے دبیز ہونے اور ان سلا ہونے کا اشارہ امرؤ القیس کے اس شعر میں بھی ہے:

خرجت بھا امشی تجر ورائنا
علی اثرینا ذیل مرط مرحل

''میں اسے لے کر نکلا، پیدل چلتے ہوئے، جبکہ وہ ہمارے نقش قدم پر ہمارے پیچھے کجاوے کی تصویروں والی دبیز چادر (مرط) کا پلو (لٹکائے) گھسیٹ رہی تھی (تاکہ پاؤں کے نشان مٹ جائیں اور کھوجی تعاقب نہ کر سکیں)۔''

امرؤ القیس نے جس طرح اس کا ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'مرط' کا غالب تصور یہی ہے کہ یہ اتنی بھاری ضرور ہوتی تھی کہ ریت پر اس کا ایک پلو گھسٹنے سے قدموں کے نشان مٹ جاتے تھے۔ کپڑے کا بھاری ہونا اس کے دبیز ہونے کی واضح دلیل ہے۔

درایت

قرآن وسنت سے تعلق

سنت متواترہ میں فجر کا وقت لفظ فجر سے متعین کیا گیا ہے۔ یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ اسی سنت پر عمل کا بیان ہے، جسے آپ نے نماز کے حکم کی بجا آوری میں اختیار کیا۔ یہ عمل ہمارے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے افق میں سفیدی ظاہر ہونے پر بھی فجر ادا کی ہے، مگر روایتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عموم میں آپ نماز فجر سپیدۂ صبح کے غالب آنے سے پہلے ہی ادا کر لیتے تھے۔ یعنی نماز فجر میں آپ کا پسندیدہ وقت وہ ہے جب روشنی نہ ہوئی ہو۔

دیگر متون

اس روایت کے متون اصلاً ایک جیسے ہی ہیں۔ صرف تین جگہ پر فرق ہے:

ایک فرق یہ ہے کہ ان روایتوں میں سے بعض میں یہ بتایا گیا ہے کہ نماز پڑھنے والی عورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات تھیں، (سنن الکبریٰ، رقم ۱۵۲۷) بعض میں یہ ہے کہ وہ بنی عبدالاشہل کی خواتین تھیں (مسند الشامیین، رقم ۲۷۱)، بعض میں ہے کہ صرف ہجرت کر کے آنے والی عورتیں تھیں (مسند الطیالسی، رقم ۱۴۵۹) بعض میں 'نساء المومنین' کا ذکر ہے (احمد بن حنبل، رقم ۲۶۲۶۵)، اور بعض میں مطلقاً 'النساء' کا ذکر ہے جیسے کہ موطا کی زیر بحث روایت میں ہے۔ ان اختلافات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک روایت کن کن تبدیلیوں سے گزر کر ہم تک پہنچتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں سیدہ عائشہ ہی سے ہیں اور پھر بھی ان میں یہ اتنا فرق پیدا ہو گیا!

اس بات سے کہ وہ عورتیں ازواج مطہرات تھیں یا بنی عبدالاشہل کی عورتیں تھیں، اوقات نماز کے پہلو سے حدیث کے مفہوم و مدعا میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اس لیے اس باب میں یہ اختلافات حدیث میں باعتبار مضمون کوئی خرابی پیدا نہیں کرتے۔ البتہ اگر یہ روایت خواتین کے پردے کے باب میں زیر بحث آئے تو اس کے مفہوم و مدعا میں یہ اختلاف مشکلات پیدا کرے گا۔

چادریں اوڑھنے کا یہ عمل، سورۂ احزاب کے نزول کے بعد ہوا یا پہلے، اسی طرح یہ سردیوں کے دنوں کی بات ہے یا گرمیوں کے دنوں کی، ان پہلوؤں پر حدیث کے الفاظ سے کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن اگر وہ روایت جس میں ازواج النبی کا ذکر ہے پیش نظر رکھیں تو پھر ایک قرینہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ شاید سورۂ احزاب کے بعد کا واقعہ ہو۔ اور اگر مہاجرات والی روایت بھی پیش نظر رکھیں تو پھر یہ سورۂ ممتحنہ کے نزول کے وقت کا واقعہ ہے۔ اور ان مہاجرات کی آمد صلح حدیبیہ کے بعد ہوئی ہے۔ غزوۂ احزاب کے بعد سورۂ احزاب نازل ہوئی ہے۔ دو روایتوں کی گواہی سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ نمازوں میں شرکت کا یہ واقعہ گمان غالب یہی ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے یہ چادریں احزاب میں بیان کیے گئے احکام

کے پیش نظر اوڑھی گئی تھیں۔ جن میں ازواج مطہرات کو فتنہ کے زمانے کے لیے کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لیے اس روایت میں 'متلفعات' کے مفہوم میں ادنائے جلباب کے معنی بھی شامل ہوں گے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ بعض روایتوں میں چادریں اوڑھنے کا عمل نماز پڑھنے سے متعلق کیا گیا ہے اور کچھ میں موطا کے ساتھ موافقت ہے کہ واپس نکلتے ہوئے چادریں اوڑھی ہوتیں۔ مثلاً بیہقی کی روایت یوں ہے:

إن نساء من المؤمنات كن يشهدن صلاة الفجر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم متلفعات في مروطهن ثم ينقلبن الى بيوتهن حين يقضين الصلاة ولا يعرفهن احد من الغلس.
(سنن البیہقی، رقم ۱۹۷۲)

''مسلم خواتین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھا کرتی تھیں، چادریں اوڑھے ہوئے، جب وہ نماز پڑھ کر واپس آتیں تو انھیں اندھیرے کی وجہ سے کوئی پہچان نہ پاتا تھا۔''

تیسرا فرق یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ آیا ہے کہ وہ عورتیں آپس میں ایک دوسرے کو نہیں پہچان پاتی تھیں 'لا یعرف بعضھن بعضا'۔ (مسند احمد، رقم ۲۶۲۶۵) اس سے تاریکی کی شدت کو اور زیادہ ماننا پڑے گا، اس لیے کہ عورتیں اگر باہم ایک دوسرے کو نہیں پہچان پاتیں تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو نہیں پہچان پاتی تھیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

احادیث باب پر نظر

اس روایت کا مضمون بظاہر کچھ دوسری روایتوں سے ٹکراتا ہے۔ ان روایتوں کے اختلاف کی وجہ سے امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ تغلیس کی فضیلت کے قائل ہیں اور فقہائے کوفہ اس کی فضیلت کے قائل نہیں ہیں۔ ابن رشد اس اختلاف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فقہا نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ فجر کا وقت صبح صادق کے طلوع سے شروع ہوتا اور سورج کے طلوع پر ختم ہوتا ہے۔ سوائے اس اختلاف کے جو ابن قاسم اور بعض شوافع سے منقول ہوا ہے کہ اس کا آخری وقت اسفار ہے۔ پسندیدہ وقت کے باب میں فقہا کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ فقہائے کوفہ، ابوحنیفہ، احناف، امام ثوری اور عراقی فقہا کی اکثریت اسفار کی فضیلت کی قائل ہے۔ البتہ مالک، شافعی، شوافع، احمد بن حنبل، ابوثور اور داؤد تغلیس کی فضیلت کے قائل ہیں۔

ان کے اختلاف کا سبب ظاہری معنی میں مختلف احادیث کو جمع کرنے میں اختلاف کی وجہ سے ہے۔ آپ سے رافع بن خدیج کے طریقے سے یہ روایت آئی ہے کہ 'اسفروا بالصبح فكلما اسفرتم فهو اعظم للأجر'، صبح کی نماز روشن کر کے پڑھو، جب بھی روشنی میں نماز پڑھو گے تو وہ اجر میں سب سے بڑھ کر ہوگی۔ جیسے یہ بھی کہ آپ سے پوچھا گیا کہ کون سا

عمل سب سے بہتر ہے، آپ نے فرمایا: 'الصلوٰۃ لأول میقاتھا'' 'اول وقت میں نماز''، یہ بات بھی آپ سے ثابت ہے کہ جب آپ نماز ختم کرتے تو عورتیں چادریں اوڑھ کر نکلتیں تو اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتیں تھیں۔اس حدیث کے الفاظ کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ آپ کا اکثر عمل اسی پر تھا۔

جس نے رافع کی حدیث کو خاص کر دیا، اور 'الصلوٰۃ لأول میقاتھا' کو عام مانا تو مشہور بات یہ ہے کہ خاص عام سے مستثنیٰ ہو گا، چنانچہ جب اس نے فجر کو اس عموم سے مستثنیٰ کیا، اور حدیث عائشہ کو جواز پر محمول کیا، اور یہ بھی کہ ان روایتوں میں آپ کے عمل کا جو بیان ہے وہ محض وقوع کا بیان ہے، نہ کہ آپ کے غالب معمول کا، تو اس نے یہ رائے بنائی کہ اسفار تغلیس کے مقابلے میں افضل ہے۔

جس نے عموم والی روایت کو ترجیح دی، اس لیے کہ سیدہ عائشہ کی روایت اس کی تائید کرتی ہے، اور رافع والی روایت ذو معنی ہے، کیونکہ اس میں اسفار کے معنی فجر کو واضح اور متحقق کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں، اس اعتبار سے عموم بیان کرنے والی روایت، حدیث عائشہ اور رافع کی روایت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔یہ نظریات رکھنے والے نے یہ رائے اختیار کی کہ تغلیس ہی افضل وقت ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے یہ رائے اختیار کی تھی کہ فجر کا آخری وقت اسفار ہے، تو انھوں نے 'من ادرک رکعة من الصبح قبل ان تطلع الشمس' والی روایت کی یہ تاویل کی کہ یہ مضطر کی سہولت کے لیے ہے۔

ان کی یہ رائے ٹھیک وہی ہے جو جمہور نے فجر کے معاملے میں اختیار کی ہے، لیکن تعجب ہے کہ انھوں نے فجر کے معاملہ میں عصر والا طریقہ کیوں اختیار نہیں کیا اور اہل ظاہر کی موافقت کر لی، اس لیے یہ وہ مسئلہ ہے جس میں اہل ظاہر کو ان سے پوچھنا چاہیے کہ آخر دونوں میں کیا فرق ہے؟'' (بدایۃ المجتہد، فی معرفۃ اوقات الصلوٰۃ، المسئلۃ الخامسۃ)

یہ فقہا کے اختلافات کا خلاصہ ہے جو ابن رشد نے بیان کیا ہے۔حضرت عائشہ کی روایت جس کی ہم شرح کر رہے ہیں، اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بظاہر تغلیس بتایا گیا ہے۔لیکن ابو برزہ کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ بتایا گیا ہے:

عن ابی برزة الاسلمی... و کان ینفتل من صلاة الغداة حین یعرف الرجل جلیسه و یقرا بالستین الی المائة. (بخاری، رقم ۵۴۱)

''ابو برزہ اسلمی سے روایت ہے... کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے اس وقت سلام پھیرتے جب نمازی اپنے ساتھ والے کو پہچان سکتا تھا، آپ ساٹھ سے سو آیتیں (فجر میں) پڑھتے تھے۔''

اس روایت میں موطا کی روایت کے برعکس آپ کا معمول یہ بتایا گیا ہے کہ آپ اس وقت نماز سے فارغ ہوتے تھے کہ نمازی اپنے ساتھی کو پہچان پاتے تھے۔ان دونوں روایتوں میں بظاہر اختلاف کے باوجود اصلاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔اس اختلاف کے نہ ہونے کے دو پہلو ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک یہ کہ یہ دراصل اسلوب بیان کا مسئلہ ہے۔یعنی جب بھی کوئی شخص دو تین دفعہ کوئی واقعہ دیکھے گا وہ یہی کہے گا ''ایسا ہوا کرتا تھا''۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دو تین دفعہ یہ دیکھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے اور سپیدہ ظاہر ہو چکا تھا اور لوگوں کے چہرے دکھائی دینے لگے تھے تو یہ شخص بھی انھی الفاظ میں بیان کرے گا، اور حضرت عائشہ بھی یہی کہیں گی کہ ''ایسا ہوا کرتا تھا''۔

چنانچہ یہ ممکن ہے کہ معمول ابو برزہ والی روایت کے مطابق ہو اور سیدہ عائشہ والا واقعہ تین چار دفعہ ہی ہوا ہو، یا صورت اس کے برعکس ہو۔لیکن دونوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز کا آغاز اندھیرے میں ہوتا تھا۔خاتمۂ نماز کے معاملے میں دونوں میں اختلاف ہے تو اگر دونوں روایتوں کو جمع کر دیا جائے تو صورت یہ سامنے آئے گی کہ کبھی فراغت کے وقت سپیدہ نمودار ہو چکا ہوتا تھا اور کبھی نہیں اور یہی بات فطری اور طبعی ہے۔

اس لیے ہمارے خیال میں دونوں روایتوں میں تطبیق کے لیے ان توضیحات کی ضرورت نہیں ہے، جو مختلف شارحین نے بیان کی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جیسا ہم نے ذکر کیا ہے کہ سیدہ عائشہ کی روایت کے الفاظ اس بات کا احتمال رکھتے ہیں کہ ان کی مراد یہ ہو کہ 'غلس' میں تاریکی بس اتنی ہوتی تھی کہ ویسے تو چہرے پہچانے جاتے تھے، مگر چادریں لپٹے ہونے کی وجہ سے انھیں پہچاننا ممکن نہیں تھا۔یعنی دونوں چیزیں مل کر پہچاننے میں رکاوٹ تھیں۔اس لیے اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ کچھ نہ کچھ روشنی پھیلی ہوئی ہو۔ابو برزہ کی روایت میں مردوں کے پہچاننے کا جو ذکر ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے عورتوں کی طرح چادریں نہیں اوڑھی ہوتی تھیں۔چنانچہ ہمارے خیال میں دونوں روایتیں ایک ہی بات کہہ رہی ہیں کہ جب آپ نماز سے فارغ ہوتے تو اتنی روشنی ہوتی کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکتے تھے۔

اس لیے ہم نے اوپر جو بات کہی ہے وہ درست معلوم ہوتی ہے کہ نماز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غلس کے آخری اور اسفار کے ابتدائی لمحات میں ادا کی جاتی تھی۔اسی طرح اس روایت کا معاملہ ہے کہ:

عبد اللّٰہ رضی اللّٰہ عنه قال: ما رأیت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم صلی صلاۃ بغیر میقاتها الا صلاتین جمع بین المغرب والعشاء وصلی الفجر قبل میقاتها. (بخاری، رقم ۱۵۹۸)	''عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اپنے مقررہ وقت سے پہلے نماز پڑھتے نہیں دیکھا، سوائے (مزدلفہ میں) دو نمازوں کے ایک جب آپ نے مغرب اور عشاء کو جمع کیا، اور دوسرے اسی دن کی فجر جسے آپ نے وقت سے پہلے پڑھا۔''

احناف نے بخاری و مسلم میں وارد ابن مسعود کی اس روایت سے یہ استدلال کیا ہے کہ فجر کو چونکہ آپ کسی نماز کے ساتھ جمع نہیں کر رہے تھے، اس لیے یہاں 'قبل میقاتها' سے مراد وہ وقت ہے جس پر آپ عموماً نماز پڑھتے۔یعنی آپ نے مزدلفہ کی

رات کوطلوع فجر سے پہلے نہیں، بلکہ اپنے معمول سے پہلے فجر پڑھی۔ بخاری کی اس سے اگلی روایت (رقم ۱۵۹۹) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ فجر ٹھیک طلوع فجر کے وقت ادا کر لی۔ اس لیے کہ اسی میں حاجیوں کے لیے سہولت تھی۔

اس سے ہماری رائے کو تقویت ملتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول ایسا تھا کہ آپ نماز اس وقت شروع کرتے جب اندھیرا ہوتا، یہ وقت غلس کا آخری وقت ہوتا۔ اگر آپ معمول سے لمبی تلاوت کرتے تو نماز کے خاتمہ تک روشنی ہو جاتی، اور اگر آپ قدرے کم تلاوت کرتے تو اندھیرے ہی میں لوگ نماز سے فارغ ہو جاتے تھے۔ گویا آج کل کی زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسفار سے پندرہ بیس منٹ پہلے نماز کھڑی کر لی جاتی تھی۔

بخاری کی درج ذیل روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز سے پہلے اور دوران میں بھی کبھی اتنا اجالا ہوتا تھا کہ صحابہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تھے۔

عن ابی برزة رضی اللّٰه عنه ، کان النبی صلی اللّٰه علیه و سلم یصلی الصبح و احدنا یعرف جلیسه و یقرأ فیها ما بین الستین الی المائة. (بخاری، رقم ۵۱۶)	''ابو برزہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھاتے تو ہم میں سے ہر اپنے ساتھ بیٹھنے والے کو پہچان سکتا تھا۔ اور فجر میں ساٹھ سے سو کے درمیان آیات کی تلاوت کی جاتی تھی۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہمارے نزدیک یہی صحیح طریقہ ہے۔ ایک اس پہلو سے کہ غلس کا آخری وقت اختیار کرنے سے سبقت الی الخیر کے اصول کے مطابق نماز کا افضل وقت بھی ہاتھ سے نہیں نکلتا۔ دوسرے اس پہلو سے کہ عامۃ الناس بالخصوص بوڑھوں اور کمزور لوگوں کی نماز میں شرکت کے لحاظ سے تنگی اور حرج بھی رفع ہو جاتا ہے:

عن رافع بن خدیج یقول قال: رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم لبلال: یا بلال نور بصلا ة الصبح حتی یبصر القوم مواقع نبلهم من الاسفار. (مسند الطیالسی، رقم ۹۶۱۔ تحفۃ الاحوذی ۱:۴۰۹)	''رافع بن خدیج کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال سے فرمایا: اے بلال نماز فجر کو روشن کرو، یہاں تک کہ لوگ اجالے کی وجہ سے اپنے (استنجے کے) ڈھیلوں کی جگہوں کو دیکھ سکیں۔''

یہ ٹھیک وہی علت ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ عامۃ الناس کی سہولت کے پیش نظر بہت اندھیرے میں نماز نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ تاریکی بلاشبہ ہوتی تھی مگر سہولت عامہ کا خیال رکھا جاتا تھا۔

روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عمومی طریق کار کے ساتھ ساتھ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے بھی فجر کے وقت میں تعجیل اور تاخیر کے ضابطہ میں تبدیلی کر دی جاتی تھی۔ ہماری اس رائے کی تائید معاذ بن جبل کی اس روایت سے ہوتی ہے جو درج ذیل الفاظ میں وارد ہے:

قال معاذ بعثنی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی الیمن فقال: اذا کان فی الشتاء فغلس بالفجر واطل القراءۃ قدر ما یطیق الناس ولا تملھم واذا کان فی الصیف فاسفر بالفجر فان اللیل قصیر والناس نیام. (تحفۃ الاحوذی ۱:۴۰۹)

''حضرت معاذ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا، تو کہا سردیوں میں صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا، اور قرآت بس اتنی ہی لمبی کرنا کہ لوگ برداشت کرسکیں، اوران میں اکتاہٹ پیدا نہ کرے۔ اور جب گرمیاں ہوں تو فجر کو سویرا کر کے پڑھنا، اس لیے کہ راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اور لوگ سوئے ہوتے ہیں۔''

ابوداؤد کی روایت میں ہے:

عن رافع بن خدیج قال قال رسول اللّٰہ اصبحوا بالصبح فإنہ أعظم لأجورکم. (ابوداؤد، رقم ۴۲۴)

''رافع بن خدیج کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز فجر کو روشن کرو، کیونکہ اس میں تمھارے لیے سب سے بڑا اجر ہے۔''

اس روایت میں 'اصبحوا بالصبح' کے الفاظ ہیں جبکہ بعض روایتوں میں 'اسفروا بالصبح' کے۔ ہمارے فقہا نے اس روایت کے درج ذیل معنی مراد لیے ہیں:

وزعموا انہ یحتمل ان یکون اولئك القوم لما امروا بتعجیل الصلاۃ جعلوا یصلونھا بین الفجر الاول والفجر الثانی طلبا للاجر فی تعجیلھا ورغبۃ فی الثواب فقیل لھم صلوھا بعد الفجر الثانی واصبحوا بھا اذا کنتم تریدون الاجر فان ذلك اعظم لاجورکم. وقد قیل ان الامر بالاسفار انما جاء فی اللیالی المقمرۃ وذلك ان الصبح لا یتبین فیہ جدا وامرھم فیھا بزیادۃ التبیین استظھارا بالیقین فی الصلاۃ. قال الطحاوی: معنی قولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اسفروا بالفجر ای طولوھا

''فقہا نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تعجیل کا حکم آنے کے بعد لوگوں نے صبح کی نماز اس اجر وثواب کے حصول کے لیے فجر اول اور فجر ثانی کے درمیان پڑھنی شروع کر دی، جو تعجیل سے فجر پڑھنے میں بیان کیا گیا تھا۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ نماز، فجر ثانی کے بعد پڑھا کرو، اور اگر تم اجر کے طالب ہو تو اس کو خوب متعین کر لیا کرو، کیونکہ اسی میں سب سے زیادہ اجر ہے۔ یہ رائے بھی دی گئی ہے کہ اسفار کا حکم صرف چاندنی راتوں کے لیے تھا، اس لیے کہ ان میں وقت فجر کا تعین اچھی طرح نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے انھیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ صبح کو واضح تر ہونے دیں اور صبح کے طلوع کو یقینی کر لیں۔ طحاوی نے کہا ہے کہ 'اسفروا بالفجر' کے معنی ہیں کہ فجر میں قرأت اسفار تک لمبی کرو، اسفار صبح کی روشنی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بالقراءة الی الاسفار وھو اضاءة الصبح.

(عون المعبود۲: ۶۶)

درج بالا روایت کا مضمون ہمارے خیال میں 'اسفار' کی فضیلت بتانے کا نہیں ہے، بلکہ نماز فجر کی اہمیت بتانے کا ہے۔ فقہا نے غالباً اس روایت کے ان الفاظ 'اسفروا بالصبح' کی وجہ سے یہ معنی مراد لیے ہیں کہ صبح کو خوب روشن کرو۔ ان کے معنی بلاشبہ صبح کو روشن کرنے ہی کے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں اس کے صحیح تر الفاظ وہی ہیں، جو ابوداؤد نے اختیار کیے ہیں: 'اصبحوا بالصبح'۔ 'اصبح یا رجل' کے معنی ہوتے ہیں 'چوکنے رہو یا بیدار ہو جاؤ'۔ 'بالصبح' میں 'باء'، 'الصبح' کو 'اصبحوا' سے متعلق کرنے کے لیے آئی ہے۔ اس صورت میں روایت کے معنی یہ ہوئے کہ 'صبح کی نماز کے بارے میں چوکنے رہو، اس لیے کہ یہ اجر میں سب (نمازوں) سے بڑھ کر ہے'۔ فجر کی سب فرض نمازوں پر فضیلت قرآن سے بھی واضح ہوتی ہے۔ اس لیے کہ صرف فجر ہی کی نماز ہے جس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ وہ مشہود ہوتی ہے۔ (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۸) یعنی اللہ اور ملائکہ کے روبرو ہوتی ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۱۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قربانی

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا، لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ، فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ، فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ. (الحج ۲۲:۳۴)

”اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کی عبادت مقرر کی ہے تاکہ وہ اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُن کو بخشے ہیں، اس لیے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو۔ (لیکن یہ وہی کریں گے جن کے دل اپنے پروردگار کے آگے جھکے ہوئے ہیں) اور (اے پیغمبر) اِن جھکنے والوں کو (اُن کے پروردگار کی طرف سے) خوش خبری دو۔“

دنیا کے تمام قدیم مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے جسے ہم اس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔ بظاہر یہ اپنے آپ کو موت کے لیے پیش کرنا ہے، لیکن غور کیجیے تو یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔[۴۶۳] (اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مردہ نہ کہو۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم اس زندگی کی حقیقت نہیں سمجھتے)۔ قرآن نے ایک جگہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت کو رکھ کر یہی حقیقت واضح کی ہے کہ نماز جس طرح اللہ کے

۴۶۳؎ البقرہ ۲:۱۵۴۔

ساتھ ہماری زندگی ہے، اسی طرح قربانی اس کی راہ میں ہماری موت ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (الانعام ۶:۱۶۲)

''کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ ایک مینڈھے کی قربانی دیں اور آیندہ نسلوں میں ہمیشہ کے لیے ایک عظیم قربانی کو اس کی یادگار بنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ'[۴۶۴] (اور ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا)۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب نسلاً بعد نسلٍ لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو قربانی پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے 'بِسْمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ' کہہ کر،[۴۶۵] ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں[۴۶۶] اس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اس کی نذر کر رہے ہیں۔

یہی نذر اسلام کی حقیقت ہے، اس لیے کہ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ سر اطاعت جھکا دیا جائے اور آدمی اپنی عزیز سے عزیز متاع، حتیٰ کہ اپنی جان بھی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ قربانی، اگر غور کیجیے تو اسی حقیقت کی تصویر ہے۔ سیدنا ابراہیم اور ان کے جلیل القدر فرزند نے جب اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کیا تو قرآن نے اسے اسلام ہی سے تعبیر کیا ہے: 'فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ'[۴۶۷] (پھر جب ان دونوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا)۔ سورۂ حج کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے، اس میں بھی دیکھ لیجیے، 'فلہ اسلموا و بشر المخبتین' کے الفاظ میں قرآن نے کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی تمھارے دل اگر اپنے معبود کے سامنے جھکے ہوئے ہیں تو اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو، اس لیے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ قربانی کی روح یہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ عبادت خاص اپنی شکرگزاری کے لیے مشروع فرمائی ہے، لہٰذا اس میں کسی دوسرے کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

قربانی کی تاریخ

قربانی کی تاریخ سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ان کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل

---

[۴۶۴] الصافات ۳۷:۱۰۷۔

[۴۶۵] بخاری، رقم ۵۵۶۵۔ مسلم، رقم ۱۹۶۶۔

[۴۶۶] یعنی نحر کے لیے جانور کو کھڑا کر کے اور ذبح کی صورت میں قبلہ رو لٹا کر۔

[۴۶۷] الصافات ۳۷:۱۰۳۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی: 'إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ'[۲۶۸]۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔ پیدایش میں ہے:

''اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائین پیدا ہوا۔ تب اُس نے کہا: مجھے خداوند سے ایک مرد ملا۔ پھر قائین کا بھائی ہابل پیدا ہوا۔ اور ہابل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قائین کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائین اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیے کو منظور کر لیا۔ پر قائین کو اور اُس کے ہدیے کو منظور نہ کیا۔'' (۴: ۱۔ ۵)

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہو گا۔ چنانچہ اس کے آثار ہم کو تمام قدیم مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو کر ہجرت کی تو اس کے ساتھ ہی دعا فرمائی کہ پروردگار، تو مجھے صالح اولاد عطا فرما۔ یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک فرزند کی ولادت کی خوش خبری دی۔ یہ فرزند اسمٰعیل تھے۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچے تو ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہو رہی ہے کہ اس بیٹے کو اپنے پروردگار کی خاطر قربان کر دیں۔ یہ ہدایت اگرچہ خواب میں ہوئی تھی اور خواب کی باتیں تاویل و تعبیر کی محتاج ہوتی ہیں، چنانچہ اس خواب کی تعبیر بھی یہی تھی کہ وہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیں، اس سے ہرگز یہ مقصود نہ تھا کہ وہ فی الواقع اسے ذبح کر دیں، لیکن خدا کے اس صداقت شعار بندے نے کوئی تعبیر نکالنے کے بجائے من و عن اس کی تعمیل کا فیصلہ کر لیا اور اس راہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ فرزند کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے اپنا خواب اسے بتایا۔ سیدنا اسمٰعیل نے اس خواب کو خدا کا حکم سمجھا اور فوراً جواب دیا کہ ابا جان، آپ بے دریغ اس کی تعمیل کریں۔ ان شاء اللہ، آپ مجھے پوری طرح ثابت قدم پائیں گے۔ بچے کے جواب سے مطمئن ہو کر ابراہیم اس کو مروہ کی پہاڑی کے پاس لے گئے اور قربانی کے لیے پیشانی کے بل لٹا دیا۔ قریب تھا کہ چھری چل جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی: ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہ ایک بڑی آزمایش تھی، تم اس میں کامیاب ہوئے، لہٰذا اب مزید کسی اقدام کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ ابراہیم کے اس فرزند جلیل کو اللہ تعالیٰ نے ایک مینڈھے کی قربانی کے عوض چھڑا لیا اور اس واقعے کی یادگار کے طور پر ہر سال اسی تاریخ کو قربانی کی ایک عظیم روایت ہمیشہ کے لیے قائم کر دی گئی۔ یہی قربانی ہے جو حج و عمرہ کے موقع پر اور عید الاضحیٰ کے دن ہم پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

۲۶۸۔ المائدہ ۵: ۲۷۔

قَالُوا: ابْنُوا لَهٗ بُنْيَانًا، فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ، فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ. وَقَالَ: اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ. رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ، فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ. فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ، قَالَ: يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ، فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى؟ قَالَ: يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ، اِنْ شَآءَ اللّٰهُ، مِنَ الصّٰبِرِيْنَ. فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ، وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ، قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ، وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ.
(الصافات ۳۷: ۹۷-۱۰۷)

’’انھوں نے کہا: اس کے لیے ایک چنائی چنو اور اسے آگ میں جھونک دو۔ اس طرح انھوں نے اس کے خلاف ایک چال کرنی چاہی تو ہم نے انھی کو نیچا دکھا دیا۔ اور (ابراہیم نے یہ دیکھا تو) کہا: میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ پروردگار، مجھے صالح اولاد عطا فرما۔ (اُس نے یہ دعا کی) تو ہم نے اسے ایک بردبار فرزند کی بشارت دی۔ پھر جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک دن) اُس نے کہا: بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے؟ اُس نے جواب دیا: ابا جان، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے، اس کی تعمیل کیجیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ آخر کو جب دونوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم، تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ بے شک، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمایش تھی۔ (ابراہیم اس میں کامیاب ہوا) اور (اِس کے نتیجے میں) اسمٰعیل کو ہم نے ایک بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا۔‘‘

قربانی کا مقصد

قربانی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔ قرآن نے یہ مقصد اس طرح واضح فرمایا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ

’’اللہ کو نہ (تمھاری) اِن (قربانیوں) کا گوشت پہنچتا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ، كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ، وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ. (الحج ۲۲:۳۷)

ہے، نہ خون، بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اُس نے اِسی طرح اِن کو تمھاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اُس کی تکبیر کرو۔ (یہی طریقہ ہے اُن کا جو خوبی کا رویہ اختیار کریں) اور (اے پیغمبر) اِن خوب کاروں کو بشارت دو۔‘‘

قربانی کا قانون

قربانی کا جو قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواترِ عملی سے ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہوسکتی ہے،

اس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے،

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰؍ ذوالحجہ کو عیدالاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے،

اس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ سورۂ حج کی آیات میں ’أَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ‘ سے یہی مراد ہیں[469]۔ اصطلاح میں انھیں ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ ان ایام میں یہ بھی مشروع ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے، اس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔ ’فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ[470]‘ کے الفاظ میں قرآن نے اس کی صراحت کردی ہے۔

قربانی کا قانون یہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے البتہ، اس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت فرمائی ہے:

اول یہ کہ قربانی ہر حال میں عید کی نماز کے بعد کی جائے گی۔ یہ اگر پہلے کرلی گئی ہے تو محض ذبیحہ ہے، اسے عیدالاضحیٰ کی قربانی قرار نہیں دیا جاسکتا[471]۔

دوم یہ کہ قربانی کے لیے اچھی عمر یہ ہے کہ بھیڑ یا بکری کا بچہ کم سے کم ایک سال، گائے بیل دو سال اور اونٹ یا اونٹنی کم سے کم پانچ سال کی ہونی چاہیے۔ یہ میسر نہ ہوں تو مینڈھا ذبح کرلیا جائے۔ یہ اگر چھ ماہ کا بھی ہو تو کفایت کرے گا[472]۔

---

[469] ۲۲:۲۸۔ ’’اور چند متعین دنوں میں اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُن کو بخشے ہیں۔‘‘

[470] الحج ۲۲:۳۶۔ ’’سو اِس میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو مانگنے کے لیے آجائیں۔‘‘

[471] بخاری، رقم ۹۵۱، ۹۵۴، ۹۸۵۔ مسلم، رقم ۱۹۶۰، ۱۹۶۱، ۱۹۶۲۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

سوم یہ کہ گائے بیل اور اونٹ یا اونٹنی کی قربانی میں ایک سے زیادہ لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ شرکا اگر سات بھی ہوں تو مضایقہ نہیں ہے، بلکہ روایتوں میں آیا ہے کہ اونٹ کی قربانی میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک موقع پر دس افراد شریک ہوئے تو آپ نے منع نہیں فرمایا۔[۴۷۳]

چہارم یہ کہ قربانی ایک نفل عبادت کے طور پر عید الاضحیٰ کے علاوہ بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے جب عقیقے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: تم میں سے جو بچے کی پیدایش پر قربانی کرنا چاہے، کر لے۔[۴۷۴]

۴۷۲؎ مسلم، رقم ۱۹۶۳۔ ابوداؤد، رقم ۲۷۹۹۔

۴۷۳؎ ابوداؤد، رقم ۲۸۰۸۔ ترمذی، رقم ۱۵۰۱۔

۴۷۴؎ الموطا، رقم ۱۰۶۶۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ساجد حمید

صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟

(۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صبر کے مصاحب

صبر کے مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان چیزوں کے ساتھ موازنہ کر کے اسے سمجھیں جن کا قرآن مجید نے صبر کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس موازنے سے نہ صرف صبر کے سمجھنے میں ہمیں مدد ملے گی، بلکہ اخلاق و اوصاف میں سے بعض ایسی چیزیں بھی ہمارے سامنے آ جائیں گی جو قرآن مجید کے نزدیک صبر کی ساتھی اس کی مصاحب، اور اس کی معاون و مددگار ہیں۔ ہم ذیل میں صبر کے انھی مصاحب کا ذکر کریں گے۔

صبر اور شکر

اس دنیا میں انسانوں سے اصلاً مطلوب شکر گزاری کا رویہ ہے۔ اسی لیے جب اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کی اور اس میں خیر کے راستے کا شعور رکھا تو ساتھ ہی یہ فرمایا کہ:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا. (الانسان ۷۶: ۳)

''ہم نے انسان کو راہ سکھائی، چاہے (اب) یہ شکر گزار بنے یا ناشکرا۔''

شکر انسان سے اصلاً مطلوب ہے۔ نعمتیں پا کر آپے سے باہر نہ ہونا، تکبر نہ کرنا، اور اللے تللے نہ کرنا، حدود آشنا رہنا، غافل نہ ہو جانا، اور اسی طرح تنگ دستی اور مشکلات میں شکوہ شکایت پر نہ اتر آنا، مایوس نہ ہونا، مایوس ہو کر خدائے حقیقی کو چھوڑ نہ دینا، سب شکر ہی ہے۔ مگر ہم پہلے رویے کے لیے شکر اور دوسرے رویے کے لیے صبر کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے تفسیری روایات میں قرآن مجید کی اس آیت کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ کے حوالے سے نقل ہوا ہے کہ ایمان کے دو حصے ہیں: ایک صبر اور دوسرا شکر۔ اس آیت کی وضاحت میں امام امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صبر اور شکر دونوں توام (جوڑا) ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔ جس کے اندر صبر نہ ہو وہ شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا اور جس کے اندر شکر نہ ہو وہ صبر نہیں کر سکتا۔ اس دنیا کے دارالامتحان میں ہر قدم پر بندے کا امتحان ہر وقت انھی دونوں چیزوں میں ہوتا رہتا ہے اور اسی امتحان پر اس کی اخروی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔'' (تدبر قرآن ۳۱۰/۶)

صبر اور شکر اصل میں اس شعور کے ساتھ زندہ رہنے کا نام ہے جسے قرآن مجید نے 'انا للّٰہ و انا الیہ راجعون' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جو کچھ آپ کو ملا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ملا ہے اور جو کچھ آپ سے چھن گیا ہے، وہ بھی اللہ ہی نے چھینا ہے۔ یہ سب اسی کا تھا، اسی نے دیا تھا اور اسی نے لے لیا ہے۔ اور یہ لینا اور دینا سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ آپ کو آزمایا جا رہا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کے اس مقام پر نگاہ ڈالتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے:

''اگر ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں، پھر اس سے اس کو محروم کر دیتے ہیں، تو وہ مایوس و ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر تکلیف کے آنے کے بعد، اس کو نعمت سے نوازتے ہیں، تو کہتا ہے کہ میری مشکلات رفع ہوئیں، پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ اکڑنے والا اور شیخی بگھارنے والا بن جاتا ہے۔ اس سے صرف وہی بچے رہتے ہیں، جو صبر کرنے والے اور نیک اعمال کرنے والے ہیں، انھی کے لیے بڑی نجات اور بے انتہا اجر ہے''۔ (ہود ۱۱: ۹۔۱۱)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن مجید کے اس اقتباس سے آپ یہ جان سکتے ہیں کہ صبر اور شکر پر قائم رہنے والے لوگ کس قدر متوازن رویہ کے حامل ہوتے ہیں، اگر انھیں ناسازگار حالات پیش آتے ہیں تو انھیں مایوسی اور دل شکستگی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے رب کے بھروسے پر صبر کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر سازگار حالات میسر آ جائیں، تو وہ اترانے والے اور فخر کرنے والے نہیں بن جاتے، بلکہ اپنے رب کے آگے اور جھک جاتے ہیں، جیسا کہ ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں کہ فتح مکہ نے آپ کی، گردن میں اکڑ کے بجائے فروتنی پیدا کی اور وہ عجز و انکسار سے اتنی جھک گئی کہ آپ کا سر اونٹنی کی گردن سے ٹکرانے لگا۔

اس بحث سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ ایک ہی رویہ جو دو مختلف حالات میں ظاہر کیا جاتا ہے، اسے ہی صبر اور شکر کہتے ہیں۔ یعنی صبر اور شکر اصل میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اور یہ دو نام ان کو مختلف حالات کے دوران میں آپ کے ایک رویے کو دیے گئے ہیں۔ آپ کا یہ رویہ اصل میں یہ ہے کہ آپ کو

۱۔ مشکلات میں مایوس اور خدا بے زار اور

۲۔ خوش حالی میں مغرور و بے پروا

نہیں ہونا۔ بلکہ یہ سوچ کر کہ آپ کو خدا نے اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا ہے اور آپ کو جو کچھ وہ دے رہا ہے اور جو

کچھ وہ چھین رہا ہے، وہ سب آپ کے امتحان کے لیے ہے، کہیں آپ کو صبر کرنا ہوگا اور کہیں شکر۔

صبر اور درگزر

صبر کا ایک ساتھی عفو و درگزر بھی ہے۔ قرآن مجید نے ان دونوں کو یوں اکٹھا کیا ہے:

''جنھوں نے اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیا، تو ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔ الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں بغیر کسی حق کے سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور جس نے صبر کیا، اور معاف کر دیا تو بے شک ایسا کرنا کارِ عزیمت ہے۔'' (الشوریٰ ۴۲: ۴۱۔ ۴۳)

اس آیت سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ دوسرے لوگ جب اذیت دے رہے ہوں اور آپ صبر کرنا چاہیں تو اس کا لازمی نتیجہ درگزر کی صورت میں نکلے گا۔ مراد یہ ہے کہ صبر یہ نہیں ہے کہ آپ کسی کی اذیت کے جواب میں پہلے تو خاموش رہیں، مگر موقع پا کر اس سے خوب انتقام لے لیں۔

چنانچہ جب آپ پر کوئی اذیت کسی کی طرف سے آئے تو آپ کے لیے دو راستے ہیں ایک یہ کہ آپ اس آدمی سے انصاف کے مطابق بدلہ لے لیں۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ آپ اسے معاف کر دیں اور اس کی اذیت پر صبر کریں۔ قرآن مجید کے نزدیک یہی دوسرا راستہ بہتر اور پسندیدہ ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صبر سے مراد یہ ہے کہ آپ دوسروں کی ان خطاؤں سے درگزر کریں، جو آپ کے لیے باعث اذیت و نقصان ہیں۔ اگر آپ نے صبر کیا ہے تو معاف کرنا ہوگا۔ ورنہ آپ کا صبر بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

یہاں یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ قرآن مجید کے نزدیک عفو و درگزر تقویٰ اور للّٰہیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ تقویٰ انسان کے خدا سے ایک تعلق کا نام ہے اور یہ تعلق اگر صحیح بنیادوں پر استوار ہو تو آدمی میں ایسی بصیرت پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے اندر ایک ہمت، شفقت اور دانائی پیدا ہو جاتی ہے، جو اس کے اندر معاف کر دینے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔ سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ، وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ. (۴۲: ۳۷)

''اور جو بڑی بڑی حق تلفیوں اور کھلی ہوئی بے حیائی سے بچتے ہیں اور وہ جب غصہ میں آتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔''

یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ یہ آیت میں مذکور بڑے جرائم سے بچتے ہیں۔ یعنی ان کا تقویٰ ان کو بڑی بڑی حق تلفیوں اور کھلی ہوئی بے حیائی سے روکتا ہے۔ اور اسی طرح ان کا یہ تقویٰ غصہ کے وقت ان کے ہاتھ اور زبان کو روکے رکھتا ہے۔ غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ 'کبائر الاثم'، حق تلفی، ظلم اور ناانصافی کی طرز کی برائیاں ہیں، 'فواحش'، نفس پرستی اور شہوت سے اٹھی ہوئی برائیاں ہیں اور 'غضب' (غصہ) انانیت، خودسری، استکبار اور خود پسندی سے وجود میں آتا ہے۔ ان تمام

چیزوں سے آدمی کو بچانے والی چیز اصل میں تقویٰ ہے۔ اگر آدمی میں تقویٰ نہیں ہوگا تو آدمی ان سب برائیوں کے ساتھ ساتھ غصہ کو بھی چھوڑ نہیں سکے گا اور غصہ کے وقت بے قابو ہو جائے گا۔ اس کو روکنے والی چیز صرف تقویٰ ہے۔

جہاد اور صبر

جہاد جیسا کہ قرآن مجید سے واضح ہے، دین کی راہ میں مصائب جھیلنے اور قتال کرنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ پہلے مفہوم کے لیے قرآن مجید نے سورۂ نحل میں جہاد کو صبر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے:

''پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے آزمایشوں میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور ثابت قدمی دکھائی (صبر کیا) تو ان باتوں کے بعد بے شک تیرا رب بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے''۔ (النحل ۱۶: ۱۱۰)

جہاد میں صبر کے معنی میدان جنگ سے فرار نہ ہونے کے بھی ہیں۔ قرآن مجید میں فرمان ہے:

... وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۷۷)

''... اور وہ جو فقر و فاقہ، جسمانی تکالیف اور جنگ کے موقع پر ثابت قدم رہنے والے ہوں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ سچے متقی ہیں''

شاید صبر کے مواقع میں سے جہاد میں ثابت قدمی، جب جان جانے کا ڈر ہو، سب سے سخت موقع ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر مجاہدین میں ثابت قدمی کا وصف موجود نہ ہو تو جنگ ہار دی جائے گی۔ صبر کا یہ وصف جتنا قوی ہوگا میدان جنگ میں اتنا ہی مجاہدین کا پلڑا بھاری رہے گا۔ قرآن مجید میں اس بات کی طرف مختلف پہلووں سے اشارہ کیا گیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پہلی قسم کا جہاد جسے ہم مجاہدہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ دین اور خدا کی راہ میں عمومی زندگی میں مشقت برداشت کرنے والا ہی دین کی خاطر میدان جنگ میں بھی مشقت اٹھا سکے گا۔ جو آدمی نماز روزہ کی مشقت برداشت نہ کر سکے، وہ بھلا میدان جنگ کی صعوبتوں میں کیسے ثابت قدم رہ سکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (آل عمران ۳: ۲۰۰)

''اے ایمان والو، اپنے اندر صبر پیدا کرو، اور دشمن کے مقابل میں ثابت قدمی دکھاؤ، اور سامان جنگ تیار رکھو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب رہو''

اس آیت میں دشمن کے مقابل میں صبر (صابروا) پر صبر (صبروا) مقدم ہے، اس لیے (صبروا) کا صبر عام صبر کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ جو دین و شریعت اور زندگی کے عام معاملات میں صبر و استقامت نہیں دکھاتا، وہ اصل میں اپنے آپ کو صبر میں ترقی کے سفر پر نہیں ڈالتا کہ جس کے بعد وہ صبر کے داعیات اور حوصلوں کو اپنے باطن میں پروان چڑھاتا چلا جائے۔ اور ان داعیات کی پرورش کرتے کرتے اس مقام تک جا پہنچے کہ آدمی میدان جنگ میں مردانہ وار لڑتے لڑتے اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دے۔

ہماری ساری زندگی نفس کے ساتھ جہاد کی زندگی ہے۔ ہمیں اس جہاد میں صبر واستقامت دکھانی ہے۔ نفس کے تیر وتفنگ کے مقابلے میں صبر کی ڈھال اور اعمال صالح کی تلوار سے دفاع کرنا ہے۔ کوئی جنگ صرف ڈھال کی مدد سے نہیں لڑی جا سکتی۔ اس کے لیے تلوار کی بھی ضرورت ہے۔ نفس کے میدان جنگ میں صبر کی حیثیت ڈھال کی ہے اور اعمال کی حیثیت تلوار کی۔ صبر ہمارے اندر وہ وصف پیدا کر دیتا ہے، جس کے ذریعے سے ہم اپنے نفس کی شہوات اور لوگوں کی اذیتوں اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی تقدیر کی سختیوں کی ضرب کو سہ لیتے ہیں۔ اور اعمال صالح ہمارے اندر کے باطل داعیات وجذبات کو ختم کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: 'ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر' بلاشبہ نماز کھلی بے حیائی اور منکر اعمال سے روکتی ہے۔

قربانی اور صبر

قربانی کا ایک نہایت ہی ایمان افروز واقعہ سیدنا ابراہیم کے فرزند اسماعیل کے ذبح سے متعلق ہے۔ جس میں جب سیدنا ابراہیم نے اپنے خواب کا ذکر اسماعیل علیہ السلام سے کیا تو انھوں نے آگے سے جواب میں کہا کہ:

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ. (الصافات ۳۷: ۱۰۲)

''اے ابا جان، جو آپ کو حکم ہوا ہے کر گزریے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابر پائیں گے۔''

جہاد اور اس قربانی میں یہ امر مشترک ہے کہ دونوں میں جان کو خطرہ لاحق ہے۔ سیدنا اسماعیل کا اپنے رب کے حکم کے سامنے اس طرح سر افگندگی اس وقت اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اس آیت سے اگلی آیت میں اس قربانی کے حکم کا جو منشا سامنے آ رہا ہے، وہ یہ تھا کہ سیدنا ابراہیم سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا اور اس کے دین کی خدمت کے لیے نذر کر دیں۔ اور پھر اس قربانی کو ہماری عیدالاضحیٰ کی قربانی سے بدل دیا گیا۔ جواب اس بات کی علامت ہے کہ قربانی اصل میں اس بات کا نام ہے کہ ہم خدا کے حضور میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔

جان کا یہ نذرانہ جیسا کہ سیدنا اسماعیل کے جواب سے معلوم ہو رہا ہے ایک عظیم صبر کا مظہر ہے۔ اسماعیل علیہ السلام کی قربانی باپ اور بیٹا، دونوں کے لیے صبر کا ایک بڑا امتحان تھی۔ سیدنا ابراہیم کو یہ بیٹا ایک طویل مدت کے بعد عطا ہوا تھا، اور اس کے جوان ہوتے ہی اس کو طلب کر لیا گیا، اس میں ان کے لیے ثبات قدم اور حق کے آگے سر افگندگی کی عظیم آزمایش تھی۔

قربانی میدان جنگ میں ہو یا راہ حق میں اپنے آپ کو وقف کر دینے کی، دونوں کے لیے ایک حوصلہ، عزیمت اور صبر واستقامت کی ضرورت ہے۔ جو راہ خدا میں چھوٹی چھوٹی قربانیوں ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ کبھی اپنی تفریحات کو خدا کے حکم کے لیے قربان کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی اپنے اوقات ولمحات کو، کبھی نیند توڑ کر اٹھ رہے ہوتے ہیں اور کبھی اپنے لذیذ کھانوں کو اٹھا کر فقیر کو دے رہے ہوتے ہیں۔ یہی وہ قربانی ہے جو سارا دن سامنے موجود رہتی ہے۔ ہر لمحہ ہم سے کسی چیز کو قربان کیے جانے کا مطالبہ ہو رہا ہوتا

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

ہے: وقت، خواہش، مال، تمنا، اور نہ جانے کیا کیا چیزیں ہیں جن کے مطالبے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کبھی فقیر دروازے پر ہوتا ہے اور کبھی کوئی ضرورت مند بھائی، کبھی ہمسایے کو ہمارے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی ہمیں ان کی، کبھی ملت پکار رہی ہوتی ہے اور کبھی دین کی نصرت۔ کبھی محلّہ مطالبہ لیے کھڑا ہوتا ہے اور کبھی پورا معاشرہ۔ کبھی ملک وقوم اور کبھی دنیا کی انسانیت۔ ہر موڑ پر ہم سے ایثار وقربانی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ان مطالبات پر اپنی جان ومال کی قربانی کے لیے اگر کوئی چیز کام آسکتی ہے تو وہ ثابت قدمی ہے۔ جسے قرآن صبر کہتا ہے۔

نماز اور صبر

نماز اور صبر کو قرآن مجید میں کئی مقامات پر ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ کہیں نماز صبر کے حصول کا ذریعہ ہے اور کہیں دوام نماز کا دارومدار صبر پر ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِھَا، وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ، فَسَبِّحْ، وَ اَطْرَافَ النَّھَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی. (۲۰:۱۳۰)

’’جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں، اس پر صبر کرو، اور اپنے رب کی، حمد کے ساتھ تسبیح کرو، سورج کے چڑھنے اور ڈوبنے سے پہلے، رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو، اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔‘‘

یہاں صبر کے بعد پانچ وقت کی نماز کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ یہ بات واضح کی جائے کہ صبر نماز پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ سورۂ مزمل میں اس کو مزید کھول دیا گیا ہے، جہاں آپ کو اسی مقصد سے نماز کا حکم دیا گیا ہے۔

دوسرا پہلو یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ صبر نماز کا اس لحاظ سے بھی مصاحب ہے کہ وہ نماز کے دوام وقیام کا سبب ہے۔ یہ بات بھی سورۂ طٰہٰ ہی میں بیان کی گئی ہے:

وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ ، وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا. (۲۰:۱۳۲)

’’اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو، اور خود بھی صبر سے اس پر جمے رہو۔‘‘

اس آیت میں صبر کے نماز کے ساتھ تعلق کا ایک دوسرا رخ واضح کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی نماز پر استقامت کے لیے اپنے اندر صبر کا وصف پیدا کرے۔ اگر صبر واستقامت کا یہ وصف اس کے اندر نہیں ہے تو وہ کبھی بھی اس نماز پر دوام سے قائم نہ رہ سکے گا۔

نماز ہمارے دل سے برائی کو ختم کرتی ہے۔ برائی کا خاتمہ کئی چیزوں سے ہمیں بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہ بے نیازی ہمارے اندر صبر کے وصف کو جنم دیتی ہے۔ یعنی ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ نماز کے قیام کے لیے جب ہمیں اٹھنا پڑے تو خواہشات نفس کو جو نماز کے لیے اٹھنے میں رکاوٹ ہوتے ہیں انھیں اپنی بے نیازی کی وجہ سے قربان کر کے اٹھ سکیں۔

نماز دراصل اللہ کی یاددہانی کا ذریعہ ہے۔ یہ یاددہانی اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے تعلق کو مضبوط کرتی ہے۔ خدا کے ساتھ تعلق

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کی مضبوطی دراصل انسان میں حوصلہ وہمت کو پیدا کرتی ہے، جس کی بنا پر آدمی بڑی سے بڑی مشکل اٹھانے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ جیسا کہ ہم صحابۂ کرام میں دیکھتے ہیں کہ وہ بدر وحنین میں کس تحمل سے اترتے اور عزم وحوصلہ کی عظیم الشان داستان رقم کر دیتے ہیں۔

ہجر جمیل اور صبر

قرآن مجید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض مواقع پر جب صبر کا حکم دیا کہ آپ کفار کی باتوں اور اذیتوں پر صبر کریں تو ساتھ ہی آپ کو ہجر جمیل کا مشورہ بھی دیا۔ سورۂ مزمل میں یہ حکم یوں بیان ہوا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا. (۷۳:۱۰)

''اور جو یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور خوب صورتی سے ان سے گریز کرلو۔''

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی رحمہ اللہ اس آیت کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''چھوڑنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک چھوڑنا تو وہ ہے جو فضیحتا اور لعن طعن کے بعد، عناد وانتقام کے جذبہ کے ساتھ ہو۔ اس طرح کا چھوڑنا عام دنیاداروں کا شیوہ ہے۔ اخیار وصالحین یہ طریقہ اختیار نہیں کرتے... وہ لوگوں کے رویے سے مجبور ہو کر انھیں چھوڑتے تو ہیں، لیکن یہ چھوڑنا اس طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویہ پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کے چھوڑنے کو یہاں ہجر جمیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح کی علیحدگی بعض اوقات اچھے نتائج پیدا کرتی ہے۔ جن کے اندر خیر کی کوئی رمق ہوتی ہے، وہ اس شریفانہ طرز عمل سے متاثر اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲۸/۹)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سورۂ مزمل کی مندرجہ بالا اس آیت سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ صبر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کو اگر لوگوں کو راہ حق میں چلتے ہوئے چھوڑنا بھی پڑے تو انھیں خوب صورت طریقے سے چھوڑیں۔ اگر آپ نے چھوڑتے وقت گالی دی یا کینہ وعناد کے ساتھ چھوڑا تو یہ صبر کے طریقے کے خلاف ہوگا۔ اس آیت کی روشنی میں آپ صبر کے اس معنی کو بھی سمجھ سکتے ہیں کہ صبر اصل میں ایسے رویے کا نام ہے کہ اگر لوگوں کو چھوڑے بنا راہ حق واخلاق پر قائم رہنا ممکن نہ ہو تو صبر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے اخلاق و کردار اور اعلیٰ اوصاف پر قائم رہتے ہوئے انھیں چھوڑ دیں۔ اپنے سینے کو ہر طرح کے کینے اور نفرتوں سے پاک رکھیں۔ ان کو دھکے دے کر اور گالی گلوچ کے بعد رخصت نہ کریں۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ چھوڑنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے لازمی فرائض وواجبات سے دست بردار ہو جائیں۔ آپ کو ان کے حقوق ادا کرنے ہیں۔ وہ بڑے ہیں تو ان کا احترام کرنا ہے۔ حاجت مند ہیں تو ان کی مدد کو آنا ہے۔ کمزور ہیں تو ان کا ساتھ دینا ہے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو آپ صابر نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ ہمیشہ کے لیے بالکل چھوڑ دینا تو غیر صابروں کا شیوہ ہے۔ جو ردعمل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اولوالعزمی اور صبر

قرآن مجید میں صبر کا ایک ساتھی عزیمت کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہیے کہ صبر کو عزیمت قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ لقمان میں ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ، اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ . (۳۱:۱۷)

''اور جو بھی مصیبت تمھیں پہنچے اس پر صبر کرو، بلاشبہ یہ عزیمت کے کاموں میں سے ہے۔''

سورۂ حٰمٓ میں یوں آیا ہے کہ

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُوْلُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ . (۴۶:۳۵)

''تو تم اولوالعزم رسولوں کی طرح ثابت قدم رہو۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر عزم و ہمت والے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ عزم کے معنی پختہ ارادہ کے ہیں۔ وہ آدمی اولوالعزم ہے، جو کسی مقصد کے لیے ارادہ کرے اور اس پر جم جائے۔ ظاہر ہے ایسا آدمی جس کا اپنے مقصد پر پورا عزم ہو اور اس کی نگاہیں اپنی منزل پر گڑی ہوں، تو وہ راستے کی مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ مگر اس کے برعکس جس کے عزم و ہمت میں کمی ہوگی اور اس کے ارادے پختہ نہیں ہوں گے تو عبداللہ بن ابی کی مانند میدان آزمایش سے بھاگ جائے گا۔ وہ منزل کو نہ پا سکے گا۔

صابر آدمی وہی ہے جو عزیمت کے ساتھ مشکلات کا سامنا کرے، اور پورے حوصلہ کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہے۔ آپ کو زندگی کے نشیب و فراز میں اگر کسی چیز کو ہدف بنائے رکھنا ہے تو وہ یہ ہے کہ میں نے آخرت میں ہر طرح سے کامیابی حاصل کرنی ہے۔ اور پھر اس منزل کو پانے کے لیے ہر حالت میں ہمیں حوصلہ مندی سے راہ گزر طے کرنا ہے۔

صبر اور تقویٰ

یہاں ہم تقویٰ کے لفظ کو صرف خدا خوفی کے معنی کے لحاظ سے زیر بحث لائیں گے۔ اس لیے کہ خدا کی طرف سے نعمتوں کا احساس اور ان پر شکر گزاری نیکیوں کی بنیاد ہے اور خدا خوفی برائیوں سے روکنے کی بنیاد ہے۔ پہلی چیز ہمارے لیے تحریک کا باعث ہے اور دوسری چیز ہمارے لیے برائی کے راستے کی رکاوٹ ہے۔ 'ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم' میں اصل بات یہی موجب فضیلت ہے کہ یہ آدمی برائی سے بچنے والا ہے۔ اپنی فطرت کا محافظ ہے۔ خدا خوفی یا تقویٰ قرآن مجید میں صبر کے ساتھ زیر بحث آیا ہے۔ (آل عمران ۳:۱۲۰)۔ اس لحاظ سے یہ صبر کا مصاحب ہے۔

خدا خوفی بے صبری میں ہونے والے اقدامات کی بھی بیخ کنی کرتی ہے۔ اور اگر ہم سے صادر ہو جائیں تو ہمیں توبہ و معذرت پر ابھارتی ہے، جو کہ حق پر ثابت قدمی ہے۔ اس لیے تقویٰ یا خشیت دراصل صبر کا ایسا ساتھی ہے، جو صبر کو پیدا کرتا اور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسے تقویت دیتا ہے۔

تقویٰ ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں میں صبر کا ایک گہرا دوست ہے۔ اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ہے اس لیے آگے ہم تقویٰ کے اہم اجزا کے ساتھ صبر کی مفاہمت کا ذکر تفصیل سے کریں گے۔

توکل اور صبر

توکل کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے آپ اور اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کریں اور اس کے سہارے پر مطمئن رہیں۔ توکل اور صبر دونوں ایک دوسرے کے معاون ورفیق ہیں۔ بعض موقعوں پر اگر توکل کا وصف آپ میں موجود نہ ہو تو آپ صبر پر قادر نہیں ہو سکتے۔ اور اگر صبر کی عادت پختہ نہ ہو تو توکل کی طرف پیش قدمی بھی ممکن نہیں ہوتی۔

یعنی جب آپ اللہ تعالیٰ کو اپنے امور کا محافظ، نگران اور کارساز سمجھتے ہوں، تو یہ تصور آپ کے اندر ایک احساس تحفظ پیدا کرتا اور مصائب وشدائد میں ہمیں ایک نئی قوت عطا کرتا ہے۔ اسی طرح صبر کی عادت آپ کو اس بات سے روکتی ہے کہ آپ جلدی میں خدا سے مایوس ہو جائیں، خدا کے ساتھ اپنے سچے تعلق پر قائم نہ رہیں تا آنکہ اللہ اس صورت حال سے نکال نہ دے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

توکل صبر کا سب سے بڑا ساتھی ہے۔ اگر آپ خدا پر توکل رکھتے ہیں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ صبر آپ کو حاصل نہ ہو۔ لیکن بہتیرے لوگ ایسے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم صاحب توکل ہیں، مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے نہایت ہی چھوٹے سے معاملے میں توکل پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور ایک بڑے حصے میں وہ توکل سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے ایک حصے میں صابر وشاکر نظر آئیں گے، مگر دوسرے حصے میں وہ نہایت بے صبرے دکھائی دیں گے۔

توکل اور صبر دکان پر بیٹھے ہوئے آدمی کے لیے مثلاً یہ ہے کہ وہ خدا کے بھروسے پر دکان میں آئے، اور اپنی اس کوشش اور محنت کے بعد گاہک کا انتظار کرے، اگر گاہک آجائے تو شکر گزار ہو۔ اور اگر گاہک آتا دکھائی نہ دے تو اپنے آپ کو یہ خیال کرے کہ وہ رب کی دی ہوئی روٹی پر ہی جیتا ہے، جس نے اسے کل تک جیتا رکھا ہے تو وہ آج بھی دے گا۔ اور اگر آج اس نے نہیں دی، تو شاید روٹی نہ ملنے ہی میں میری زندگی ہے۔ اس لیے کہ زندگی صرف دو ٹکڑے روٹی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس روحانی لگاؤ کا نام بھی ہے جو مالک کی طرف سے روٹی نہ ملنے کے باوجود اسی کے دروازے پر بیٹھے رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ شاید اسی بات کو سمجھاتے ہوئے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آدمی صرف روٹی سے ہی نہیں جیتا، بلکہ کلمہ سے بھی جیتا ہے۔ یہی صبر ہے جو توکل آپ کے اندر پیدا کرتا ہے۔

یہ توکل اور صبر ان لوگوں کے لیے ایک مشکل بن جاتا ہے، جو میدان دعوت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے اوپر جب نقد اور طعن وتشنیع کے تیر برسائے جاتے ہیں تو وہ اپنے معاملے کو خدا کے حوالے کرنے کے بجائے جواب دینے کے

لیے خود میدان میں اتر آتے ہیں۔ ایسے لوگ دعوتی زندگی میں اخلاق کی جنگ ہار جاتے ، اور بالآخر دین کے نقصان کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس میدان میں لازماً خدا کے فیصلوں ہی کا انتظار کرنا چاہیے، خواہ یہ انتظار ہماری زندگی کے خاتمے پر ہی ختم ہو۔

گھریلو زندگی میں بھی توکل ہی کے سہارے سے صبر اور قناعت پیدا ہوتی ہے۔ بیویاں بالعموم اس توکل سے محروم ہوتی ہیں کہ رزق و پوشاک اللہ ہی دینے والا ہے، ہاں البتہ ان کے شوہر اگر ناکارہ بیٹھے رہتے ہوں تو ان کو سمجھانا اور نہ ماننے پر خاندان کے بزرگوں اور بالآخر عدالت کو بیچ میں ڈال کر انھیں کام پر مجبور کرنا یہ صبر اور توکل کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن اگر شوہر پوری محنت کرتا ہے۔ نچلا نہیں بیٹھتا اور اپنی کمائی شراب اور جوئے میں نہیں لٹاتا، مگر اس سب کچھ کے باوجود رزق میں تنگی ہے تو پھر خدا کے فیصلے پر راضی رہنے کی کوشش ہمارے لیے صبر کا ذریعہ بنے گی۔

اس کی ایک عام مثال اولاد سے محرومی کی بھی ہے۔ اولاد اگر نہیں ہوتی تو سسرال اور شوہر ایک ظالم گروہ کی طرح اپنی بہو بیٹی پر یلغار کر دیتے ہیں، پہلے باتوں کی صورت میں اور پھر طلاق یا مارنے پیٹنے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ خدا پر توکل رکھنے والے ایسے رویے اختیار نہیں کرتے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

صبر اور انتظار

صبر کا ایک بڑا پہلو انتظار بھی ہے۔ اس معنی میں یہ سورۂ حجرات میں آیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ. وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ. (۴۹: ۴-۵)	''بے شک جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں اکثر سمجھ رکھنے والے نہیں ہیں۔ اگر یہ لوگ صبر (یعنی انتظار) کرتے حتیٰ کہ تم خود ہی ان کی طرف نکل آتے۔ تو ان کے لیے یہ بہتر ہوتا۔''

صبر یہ چاہتا ہے کہ آپ اپنے اندر انتظار کا وصف بھی پیدا کریں، انتظار جلد بازی کا بھی متضاد ہے اور بے صبری کا بھی۔ ان آیات میں جس بے صبری کا ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنا چاہتے تھے۔ اور آ کر اگر دیکھتے کہ آپ ملاقات کی جگہ پر نہیں ہیں تو وہ آپ کے حجروں کے سامنے کھڑے ہو کر مسلسل آوازیں دیتے رہتے۔ اس کے پیچھے غالباً ان کا محرک یہ ہوتا تھا کہ ہمیں اہمیت دی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلد ان کے ملنے کے لیے باہر آ جائیں۔

اس کے پیچھے کی نفسیات ظاہر ہے، ایک بدویانہ تربیت کا نتیجہ ہے۔ جس میں چھوٹے بڑے کے آداب، ملنے جلنے اور معاشرے کی کسی بڑی شخصیت کے ساتھ معاملہ کرنے کی عدم تربیت ایک اہم جز ہے۔

بعض اوقات صبر کے معنی محض انتظار کے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان مواقع پر صرف انتظار کر لیں تو یہ گویا آپ نے صبر کیا۔

مثلاً آپ نے کسی کے دروازے پر دستک دی تو پھر آپ کو انتظار کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ بے صبری سے دستک پر دستک دیتے جائیں اور گھر والا نماز پڑھ رہا ہو، یا اتنا بیمار ہو کہ اٹھ کر آ ہی نہ سکتا ہو اور آپ اس کے لیے تکلیف کا باعث بن رہے ہوں۔ آپ کی بے دھڑک مسلسل دستک کسی کے لیے اذیت کا باعث بن سکتی ہے، اور اگر وہ آپ پر اپنی اذیت کا اظہار نہ بھی کرے تو آپ تو بہر حال اذیت دینے کا باعث بن گئے ہیں۔

سڑکوں پر چلتے ہوئے، آپ یہ اکثر دیکھیں گے کہ ہمارے بھائی اشارہ بند ہونے کے باوجود پیچھے سے ہارن بجاتے رہتے ہیں۔ یہ نہ صرف عدم شایستگی کی علامت ہے، بلکہ ان کی بے صبری کا بھی اظہار ہے۔ اگر وہ انتظار کریں تو اگلے آدمی کو آپ اذیت نہیں دیں گے۔ وگرنہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ ہارن بجا بجا کر ماحول میں شور پیدا کرتے اور اپنے سے اگلے گاڑی والوں کے لیے بالخصوص اذیت کا باعث بنتے ہیں۔ اسی بے صبری کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب آپ اشارہ توڑتے ہوئے چوک پار کر جاتے ہیں۔ آپ کی یہ بے صبری آپ کے جسم و جان کے نقصان کا باعث بھی ہو سکتی ہے اور دوسروں کے بھی۔ پہلی صورت میں آپ نے نقصان اٹھایا اور دوسری صورت میں آپ نقصان دینے والے بن گئے۔ دونوں چیزیں ظاہر ہے کہ اچھی نہیں ہیں۔

گھروں میں ساس اور بہو، اور میاں اور بیوی کے جھگڑوں میں ایک بڑا سبب یہی بے صبری ہے۔ سب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ادھر ہم حکم کریں اور ادھر کھانا یا کپڑے تیار ہو کر ان کے ہاتھ میں تھما دیے جائیں۔ یا ادھر ہم نصیحت کریں اور اگلے ہی لمحے اصلاح ہو جائے۔ انسانی زندگی میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ چیزیں بھی فوراً تیار نہیں ہوتیں اور اصلاح تو بالخصوص فوراً نہیں ہو جاتی۔ کچھ چیزیں لوگوں کی عادت بن جاتی ہیں، اور کچھ چیزیں عادت نہ سہی مگر کسی کو کسی نہ کسی پہلو سے اچھی لگ سکتی ہیں۔ مگر چونکہ وہ آپ کو اچھی نہیں لگ رہی ہیں اس لیے آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ فوراً چھوڑ دے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے ہی دن ایمان لے آتے ہیں اور عمر رضی اللہ عنہ ایک سال بعد لیکن دونوں کا درجہ ہم سب جانتے ہیں کہ بس انیس بیس ہی کا فرق رہا ہوگا۔ ہم یہاں یہ نہیں کہہ سکتے کہ سیدنا عمر کفر پر ضد کر رہے تھے۔ نہیں ایسا نہیں تھا، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو ایک سال تک اپنی قبائلی اور دینی روایات کے مطابق ایک اچھا عمل سمجھتے تھے۔ جب آپ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ حق تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے تو فوراً تبدیل ہو گئے۔ انھوں نے اپنی اصلاح کر لی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر بے صبری سے کام لیتے تو وہ دعا نہ کرتے کہ اے اللہ مجھے ایک عمر دے دے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آپ نے پوری زندگی بھی بعض لوگوں کی اصلاح کا انتظار کیا ہے۔ جس کے اثرات ہم فتح مکہ کے موقع پر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ انتظار نہ کیا جاتا اور مثلاً ہجرت مدینہ کے موقع پر ہی سب کو ناقابل اصلاح قرار دے دیا جاتا، تو یہ بے صبری ہوتی۔ اسی لیے قرآن مجید آپ کو

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بار بار یہی نصیحت کرتا رہا کہ 'فاصبر لحکم ربك' (اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کرو)۔

استعانت وصبر

قرآن مجید میں 'استعینوا بالصبر والصلوٰة' (البقرہ) میں صبر کو استعانت کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ صبر بعض مشکلات میں ہمارا مددگار بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ کی مدد اور توفیق حاصل کرنے کا ذریعہ صبر بنتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صبر ہماری مدد کیسے کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ یہ جان لیں کہ اللہ کی اس مدد سے کیا مطلب ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں مدد سے مراد ایمان لانے یا اس پر قائم رہنے پر مدد ہے۔ دنیا کی مشکلات رفع کرنے میں بھی اللہ کی مدد صابر آدمی کے شامل حال ہوتی ہے، مگر ہر دفعہ ایسا ہونا لازم نہیں ہے۔ یعنی ہماری مراد یہ ہے کہ یہ لازم نہیں کہ صبر کرنے والے آدمی کو ہر ہر دفعہ ایسا ہو کہ ادھر وہ صبر کرے اور ادھر اس کی مشکل رفع ہو جائے۔ یہ دنیا چونکہ آزمایش کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے ہر دفعہ اگر نیکی کا صلہ اچھا مل جائے یا اس پر نقصان نہ ہو تو آزمایش باقی نہیں رہے گی۔ اس لیے کہ نیکی کے ساتھ اگر خیر کے نتائج ہمیشہ نکلنے لگیں تو غیب کا وہ پردہ اٹھ جائے گا، جس کی وجہ سے انتخاب کے لیے آخرت تک انتظار کی ضرورت نہیں ہوگی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ دنیا چونکہ اس لیے بنائی گئی ہے کہ نیکی کرنے والے کو دراصل اجر آخرت میں ملنا ہے۔ اسے اس دنیا میں نیکی پر ہمیشہ کوئی بھلائی نہیں ملتی، بلکہ اللہ تعالیٰ آزمانے کے لیے کبھی کبھی مزید سختی کر دیتے ہیں تاکہ نیکی پر غیب کا پردہ پڑا رہے اور آزمایش کا یہ سلسلہ چلتا رہے۔

لیکن ایک مدد آپ کو ہر دفعہ شرطیہ طور پر ملے گی کہ آپ اگر صبر کریں گے، اور حق پر قائم رہنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کا ایمان بچانے کے لیے لازماً آئے گی۔ اس کی بہترین مثال سیدنا یوسف کی زندگی میں ہے کہ جب زلیخا نے اپنے پورے اصرار کے ساتھ اور بادشاہ کی بیوی ہونے کے زور پر انھیں کمرے میں بند کر لیا تو اس کے باوجود اللہ کی مدد نے آکر انھیں بچا لیا، اور ان کے اندر کے ایمان وتقویٰ میں وہ قوت پیدا ہوئی کہ وہ بھاگ نکلے۔ ٹھیک اسی طرح آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ مگر شرط یہی ہے کہ آپ ایمان وتقویٰ پر قائم رہیں اور اس بات کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار رہیں کہ اس کے بعد سیدنا یوسف کی مانند کچھ مشکلات سہنا پڑیں گی، جیسے انھیں جیل جانا پڑا۔

اوپر ہم نے عرض کیا کہ صبر اللہ کی مدد آنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ مدد اللہ تعالیٰ کرتے ہیں، مگر صبر ہمیں کرنا ہے جیسا کہ اس آیت سے اشارہ ملتا ہے: 'استعینوا باللّٰہ واصبروا' (۷: ۱۲۸) ''اللہ سے مدد مانگو، اور صبر کرو۔'' یعنی اللہ کی مدد اور توفیق کے شامل حال ہونے کا ذریعہ صبر بنتا ہے۔ صبر اصل میں ہماری طرف سے ایک شرط ہے جو اگر ہم پوری

کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں کہ اگر آپ یہ فیصلہ کریں کہ آج کے بعد سے آپ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اور اگر آپ ایسے مواقع پر جہاں ہمیں نقصان کا اندیشہ ہو، وہاں بھی جھوٹ نہ بولیں تو اللہ تعالیٰ کی یہ توفیق ہمیں ہمیشہ حاصل رہے گی کہ آپ پر اگر وہ کوئی مشکل بھیجے گا تو ایسی نہیں ہو گی کہ آپ ایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

ہمیں اپنی زندگی میں ہر موڑ پر صبر سے مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً گھریلو مسائل میں صبر ایک نہایت ہی مددگار ہتھیار ہے۔ جو ہمیں کئی جھگڑوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے۔ گھریلو جھگڑوں میں صبر سے مدد لینے کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی آپ کے گھر میں وقوع پزیر ہوا ہے، اس پر جذبات میں آ کر کوئی اقدام کرنے سے پہلے معاملات کی تحقیق کریں۔ مثلاً ساس بہو کے جھگڑے میں اگر بہو کا شوہر والدہ کی بات سنے اور سنتے ہی بیوی کے خلاف کوئی انتہائی اقدام کرے تو یہ بے صبری ہو گی۔ یا بیوی کی بات سنتے ہی والدہ کے خلاف کوئی بری حرکت کر ڈالے تو یہ بھی ناانصافی ہو گی۔

آپ پر ایسے مواقع پر لازم ہے کہ آپ جھگڑے کے دونوں فریقوں کا موقف جانیں۔ جھگڑے کی اصل وجہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس کا تدارک ہو سکتا ہے تو وہ کریں اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ اس لیے کہ اگر آپ نے عدل نہ کیا تو یہ چیز موقف حق سے ہٹنا ہے۔ اور یہ ثابت قدمی اور صبر کی خلاف ورزی ہے۔ آپ کا فریقین میں سے کسی کے خلاف فوری کوئی قدم نہ اٹھانا ہی یہاں صبر ہے۔

دفتر اور کاروبار میں بھی اسی طریقے کو اپنانا چاہیے۔ اس رویے سے آپ کے ساتھی آپ سے متنفر و بے زار نہیں ہوں گے اور آپ کو ایک سمجھ دار آدمی سمجھتے ہوئے آپ کے ساتھ ہمیشہ اچھا تعلق رکھیں گے۔ اگر آپ سربراہ ہیں، تو آپ اپنے تجربہ کار ساتھیوں سے محض جلد بازی کے فیصلوں سے محروم نہیں ہوں گے اور ان کی خیر خواہی آپ کو حاصل رہے گی وغیرہ۔ اگر آپ ملازم ہیں، تو آپ اپنے ساتھیوں کے لیے ایک ایسے متوازن رویے کے ساتھ سامنے آئیں گے جو آپ کے لیے دفتری زندگی میں ہمیشہ ممد و معاون ہو گا۔

دینی زندگی میں اگر صبر نہیں ہے تو آپ قدم قدم پر توبہ شکنی کر رہے ہوں گے۔ یہاں ہر ہر قدم پر صبر کی ضرورت ہے۔ دین چونکہ اخلاق کا نام بھی ہے اور عبادت کا بھی، اس لیے دونوں پر قائم رہنے کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ یہاں صبر کے معنی انھی دونوں چیزوں پر دوام کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ 'أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ' ''اللہ کے نزدیک پسندیدہ ترین عمل وہ ہے جو خواہ مختصر ہو مگر ہمیشہ ہوتا رہے۔'' (بخاری، رقم ۶۴۶۵)

یہود سے جب اللہ تعالیٰ نے یہ بات فرمائی کہ 'استعینوا بالصبر و الصلاۃ'، نماز اور صبر سے مدد لو، تو یہ اس پس منظر میں کہی گئی تھی کہ یہود باوجود اس کے کہ وہ تورات پڑھ رہے تھے۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیشین گوئیاں پڑھتے تھے۔ اور اسی لیے مدینہ کے پاس یثرب میں آ کر مقیم ہوئے تھے۔ مگر جب وہ نبی آیا تو انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ وہی ہوا جو یہود کی بابت سیدنا مسیح نے فرمایا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دلھنوں کی طرح تیار ہو کر بیٹھو اور انتظار کرتے رہو، مگر

جب وہ دلہا آئے تو تم سو چکو۔ یعنی ان سے مطالبہ بس یہی تھا کہ حق پر ثابت قدمی دکھاؤ، یہ حق خواہ تمھارے بھائیوں اور دشمنوں ہی کے پاس کیوں نہ ہو۔ اگر تم حق پر قائم رہنے کی کوشش کرو گے تو یقیناً یہ عمل تمھیں ایمان کی طرف لے جائے گا۔

یہود سے کفر کا صدور اس لیے ہوا کہ ان کے نزدیک حق پر قائم رہنا اصل مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ تو بس اپنے آپ ہی کو حق پر سمجھتے تھے۔ خواہ وہ بڑی سے بڑی گمراہی کا شکار ہوں۔ چنانچہ جب رسول امی مبعوث ہوئے تو حق پر قیام کے بجائے انھوں نے اپنے تحریف شدہ دین اور اپنی بدعات اور بدعقیدگی پر قائم رہنے ہی کو ترجیح دی۔ چنانچہ قرآن نے ان سے کہا کہ تم حق پر رہنے کا جذبہ پیدا کرو۔ یہی صبر ہے جس سے تمھیں اس نبی امی کو ماننے کی توفیق و مدد ملے گی۔

قومی تعمیر یا سیاسی کاموں میں بھی صبر ایک نہایت ہی اعلیٰ قسم کا مددگار ہے۔ یہ آپ کو جلد بازی میں ڈالے بغیر نتائج کے انتظار کی توفیق بخشتا ہے۔ آپ طویل المعیاد کی منصوبہ بندی (Long term planning) کر سکتے ہیں۔ جس کے نتائج زیادہ گہرے اور زیادہ دیرپا ہوتے ہیں۔ انبیا چونکہ اسی طرح کی منصوبہ بندی کے تحت کام کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات سے امتیں وجود پزیر ہوتی ہیں۔ لیکن جو لوگ کام تو بعض اوقات بڑے بڑے کر جاتے ہیں، مگر اس بے صبری کی وجہ سے ایسے نقائص اپنے کاموں میں چھوڑ جاتے ہیں کہ وہ کام دیرپا نہیں رہتے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

باہمی اتحاد اور صبر

صبر کا ایک اور ساتھی قرآن مجید نے اتحاد کو بنایا ہے۔ قرآن مجید نے میدان جنگ میں صبر کے حکم سے پہلے باہمی تنازعات سے روکا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر تم نے باہمی تنازعات نہ چھوڑے تو تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (الانفال ۸: ۴۶) قرآن مجید کے اس مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں ثابت قدمی (صبر) اگر فوج میں اتحاد نہ ہو تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان کے قدم اکھڑ جائیں گے اور نتائج دشمن کے حق میں نکلیں گے۔

میدان جنگ کے دشمنوں سے نبرد آزمائی بھی ثابت قدمی اور صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ نفس پر حملہ آور شیاطین سے جنگ میں بھی ثابت قدمی کی ضرورت ہے۔ میدان جنگ میں جس طرح اتحاد پیدا کرنے کے لیے باہمی تنازعات سے چھٹکارا پانے کو کہا گیا ہے ویسے ہی شیطان کے مقابل میں آنے کے لیے بھی باہمی منافرتوں کو چھوڑ کر آپس میں ایک خیر خواہانہ تعلق بنانا پڑے گا۔ جس کا حکم قرآن مجید نے سورۂ عصر میں یوں دیا ہے:

> وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ، وَاتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَاتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (۱۰۳: ۱۔۳)

> ''(رسولوں کا) زمانہ گواہی دیتا ہے کہ یہ انسان خسارے میں ہے، ہاں وہ نہیں جو ایمان لائے، انھوں نے نیک اعمال کیے، حق بات کی نصیحت کی اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کی۔''

اس سورہ سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ دنیا میں برائی سے بچ کر رہنے کے لیے اور اپنے نفس کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ

ضروری ہے کہ ہم آپس میں 'تواصی بالحق' اور 'تواصی بالصبر' کی بنیاد پر اپنے تنازعات کو بھلا کر نصیحت اور اصلاح کرنے اور اصلاح ہونے کے بعد اس صحیح حالت پر قائم رہنے کے لیے صبر (ثابت قدمی) کی تلقین بھی کریں۔

صبر یا ثابت قدمی اس سورہ کے دروبست سے معلوم ہو رہا ہے کہ باہمی تعاون ہی سے پیدا ہو گی۔

صبر اور مرحمت

صبر کا ایک اور ساتھی مرحمت یا ہمدردی ہے، جسے قرآن مجید نے صبر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ صبر کے معاملے میں ہمدردی کا کردار ویسا ہی ہے جیسا ہم نے اوپر تواصی کے حوالے سے دیکھا ہے۔ ہمدردی ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ اور ہمارے لیے ایک دوسرے کے ساتھ نظری و عملی اختلافات کو کم کرتی ہے۔ ہمارے اندر اگر دوسروں کے لیے ہمدردی پیدا ہو جائے تو لوگوں کو دیکھنے کا زاویۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے اور ہم ایک دوسرے کے بارے میں اچھے احساسات رکھنے لگتے ہیں، جس کی بنا پر ہماری باتیں اور ہمارا تعلق ایسا بنتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ نفرت اور دشمنی رکھنے کے بجائے ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ بنتے ہیں۔ یہ باہم ہمدردی ہمارے اندر ایسے جذبے پیدا کرتی ہے کہ جو ایک دوسرے کے لیے خیر خواہی اور محبت کو نمو دیتے ہیں۔ یہ چیز ہمارے ماحول میں ایسی اپنائیت پیدا کر دیتی ہے کہ ہمارے لیے سب لوگ خیر خواہ بن جاتے اور ہمیں غلطی کرتے دیکھ کر روکتے، ہمارے ہاتھ آگے بڑھ کر تھام لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے مؤقف حق سے ہٹنے سے بچ جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے صبر کے ساتھ مرحمت کا ذکر سورۂ بلد میں یوں کیا ہے:

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ. (۹۰:۱۷)	''پھر ان میں جو ایمان لائے، اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔''

جس طرح مرحمت اور ہمدردی صبر کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا کر دیتی ہے، اسی طرح صبر کی صلاحیت کے بغیر ہمدردی اور خیر خواہی وجود میں نہیں آ سکتی۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ سورۂ عصر کی تفسیر میں اس آیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دیکھو تمام بھلائیوں اور نیکیوں میں سے قرآن نے اس نیکی کو کس طرح چھانٹ لیا ہے جو درحقیقت سب نیکیوں کی اصل اور سب کا خلاصہ ہے۔ صرف مرحمت ہی کا رشتۂ محبت ہے، جو پراگندہ اور بکھرے ہوئے دلوں کو ایک نقطہ پر مجتمع کرتا ہے اور سب کو جود و کرم اور فیاضی و ہمدردی کے جوش سے معمور کر کے زندہ و حساس بنا دیتا ہے۔... اس کے بعد صبر کی تعلیم فرمائی کیونکہ جب تک آدمی لوگوں کی پہنچائی ہوئی اذیتیں جھیلنے اور ان کی غلطیوں سے چشم پوشی اور درگزر کرنے کا عادی نہ ہو جائے اس وقت تک صحیح مرحمت وجود میں نہیں آ سکتی۔'' (مجموعۂ تفاسیر فراہی ۳۴۵)

صبر اور حق

صبر اور حق بھی سورۂ عصر میں ایک دوسرے کا قرین بن کر آئے ہیں۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ سورۂ عصر کی تفسیر میں ان دونوں

کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نجات کا دارو مدار عقلی اور اخلاقی قوتوں کی اصلاح پر ہے۔ عقل اور دل دونوں کے سختی اور نرمی کے اعتبار سے دو پہلو ہیں۔ عقل کی نرمی کا پہلو یہ ہے کہ وہ حق کے سامنے فوراً جھک جانے کے لیے مستعد رہے، وہ جہاں بھی اور جس وقت بھی ظاہر ہو، اور قلب کی نرمی یہ ہے کہ وہ خالق کی محبت اور مخلوق کی ہمدردی میں ہمیشہ سرشار رہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ حق پر ایمان لاتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، اس کی صفات اور اس کی آیات پر ایمان۔ قلب بندگی کرتا ہے اور پھر بے تابانہ اپنے مولاے حقیقی کی طرف لپکتا ہے۔ اسی طرح دوسری طرف خلق کی ہمدردی کا جو فرض اس پر عائد ہوتا ہے، اس کے جوش و احساس سے معمور ہو جاتا ہے۔

عقل کی سختی کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس حق پر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، ثابت قدم رہے۔ اس باطل کو جو نگاہوں کے سامنے موجود ہے چھوڑے۔ اس سختی کے پہلو سے دل کا فرض یہ ہے کہ وہ مصائب و شدائد کے مقابل میں ڈٹا رہے۔ اور اپنے قدم جادۂ مستقیم سے نہ ڈگنے دے، اور قابو پا جانے کے بعد عفو و درگزر سے کام لے۔

یہ حق اور صبر کا تعلق عقل و دل سے ہوا۔'' (مجموعۂ تفاسیر فراہی ۳۵۵)

دوسرے یہ کہ حق کی بقا کا انحصار صبر پر ہے صبر کے بغیر حق پر قیام ناممکن ہے۔ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی آل عمران کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''دین کا بڑا حصہ اسی صبر پر قائم ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ وصف نہ ہو تو کوئی طمع، کوئی ترغیب، کوئی آزمایش بھی اس کو حق سے ہٹا کر باطل کے آگے سرنگوں کر دے سکتی ہے۔ جو شخص سچائی کے راستے پر چلنا چاہے، اور اس پر چل کر اس پر استوار رہنے کا خواہش مند ہو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔ مزاحمتوں کے مقابلے کے لیے جبکہ اس رہ میں ہر قدم پر مزاحمتوں سے مقابلہ ہے اصلی ہتھیار بندے کے پاس یہی ہے۔ فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے دین نصف شکر اور نصف صبر ہے لیکن عملی تجربہ گواہ ہے کہ آدمی میں صبر نہ ہو تو شکر کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۳)

صبر اور ثابت قدمی

اگرچہ صبر کے معنی ثابت قدمی کے ہیں، مگر جس طرح ہم مترادفات کو ایک دوسرے کے ساتھ عمل و نتیجہ اور لفظ کے اندر کسی معنوی کمی کو پورا کرنے کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔ ٹھیک ایسے ہی سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت میں صبر کے ایک نتیجہ کے طور پر ثابت قدمی کا ذکر ہوا ہے۔ یہ آیت جالوت کے ساتھ بنی اسرائیل کی جنگ کے حوالے سے ہے، جس میں صالحین یہود نے یہ دعا کی کہ:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا، وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. (۲:۲۵۰)	''اے ہمارے رب ہم پر صبر انڈیل دے، اور ہمارے قدم مضبوط رکھ، اور ہمیں کافر لوگوں پر غلبہ عطا کر۔''

اس آیت میں صبر اور ثابت قدمی سبب اور مسبب کے طور پر عطف ہوئے ہیں۔ یعنی صبر ہی وہ چیز ہے جس کے حاصل

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

ہونے سے ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے۔

صبر اور دانائی (حکمت)

قرآن مجید نے مشرکین مکہ کے ظلم وستم کے مقابل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو ان کی اس برائی کے بدلے میں نیکی کرنے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ جو اپنے دشمنوں کے خلاف یہ رویہ اختیار کرے گا اس کا دشمن بھی ایک پرجوش دوست بن جائے گا۔ پھر اس رویے کو قرآن مجید نے دانائی قرار دے کر کہا کہ یہ دانائی صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملتی ہے۔ (حمٰ السجدہ ۴۱: ۳۵)

قرآن مجید کا یہ بیان یہ بتا رہا ہے کہ صبر ایک اعلیٰ درجے کی سمجھ داری سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک اعلیٰ سمجھ داری یہ ہے کہ ہم برائی کے بدلے میں نیکی کرتے چلے جائیں۔ یا ایسا موقف اختیار کریں کہ جس سے ہمارے ستم گر میں یہ احساس پیدا ہو کہ میرا مظلوم ایک اور ہی دنیا کا آدمی ہے۔ ایسی ہی بصیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات میں جا بجا ملتی ہے۔ محض آپ کے اسی سلوک کی بنا پر نہ جانے کتنے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ہوں گے۔

بصیرت صابر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بصیرت کی ایک جھلک اس آدمی کے مقابل میں ہمارے سامنے آتی ہے، جس نے آپ سے قرض واپس لینا تھا چنانچہ وہ بے وقت مطالبہ کرنے لگا، اور کچھ سختی ظاہر کی۔ صحابہ کو اس پر غصہ آیا، لیکن آپ نے فرمایا اسے معاف کرو اس لیے کہ 'ان لصاحب الحق مقالا'، جس کا ہمارے ذمہ کچھ حق ہوتا ہے اسے کچھ کہنے کا بھی حق حاصل ہے۔ پھر آپ نے اس کے قرض سے بہتر قرض ادا کر دیا۔ (بخاری، رقم ۲۱۸۳) اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ صابر آدمی کس بصیرت کے ساتھ معاف کرتا ہے۔ وہ منتقم نہیں ہوتا، جس سے وہ لوگوں کے دل جیت لیتا ہے۔ چنانچہ یہ آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔

اللہ اور صبر

قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ. (۱۶: ۱۲۷)

''اور صبر کرو، اور تمھیں اللہ کے بغیر صبر حاصل نہیں ہو سکتا۔''

اس آیت میں صبر کے حصول کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس کی وضاحت میں یہاں ہم چند پہلوؤں کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ اوپر والی آیت کو سامنے رکھیے اور قرآن کے اس فرمان کو بھی سامنے رکھیے کہ 'ان اللّٰہ مع الصابرین' کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ان دونوں آیتوں کو تقابل میں رکھیں تو صبر اللہ سے ملتا ہے اور صبر کرنے والے کے ساتھ اللہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ صبر اللہ کے تعلق کی مضبوطی سے ملتا ہے اور صبر سے اللہ ملتا ہے۔ اس طرح سے ان دونوں میں ایک

دوری (Circular) تعلق وجود میں آجاتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ایمان باللہ اور صبر لازم وملزوم ہیں۔

اللہ اور صبر میں ایک اور تعلق بادنیٰ تامل سامنے آتا ہے اور وہ اللہ سے تسلیم ورضا کا تعلق ہے۔یعنی اللہ کے حوالے سے صبر کے معنی یہ ہوئے کہ آپ ہر حالت میں اللہ کے رب ہونے پر راضی رہیں۔ مشکل اور آسانی، تنگی اور خوشحالی، صحت اور بیماری ہر طرح کے حالات میں اس بات پر راضی رہیں کہ اللہ میرا رب ہے۔یہی وہ ایمان کی منزل ہے، جسے حاصل کرنے میں صبر ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اگر اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ اس کے تعلق کو نبھانے کے لیے صبر کا ساتھ نہ ہوتو آدمی ہر قدم پر ڈگمگاتا اور خدا سے شکوہ و نالہ کرنے لگتا ہے۔اور پھر وہ درجہ بھی جلد ہی آجاتا ہے کہ آدمی خدا کو چھوڑ کر دوسرے دروازوں کے دھکے کھا رہا ہوتا یا الحاد کے نہ ختم ہونے والے بے منزل راستے پر جا نکلتا ہے۔

خدا کے ساتھ اسی وفا شعاری والے تعلق کا نام تقویٰ ہے۔خدا کے ساتھ جڑے رہنا، اور ہر حالت میں اسے رب تسلیم کیے رکھنا یہ استقامت ہے۔اس استقامت کا مطالبہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ہم سے کیا ہے:'إن الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا'یعنی جنھوں نے حق قبول کیا اور پھر اس پر قائم رہے۔ یہ صبر کے دینیات میں اصل معنی ہیں۔یعنی یہ کہ آپ اس بات پر ہمیشہ قائم رہیں کہ اللہ میرا رب ہے۔

اللہ کے ساتھ صبر کا تعلق نماز کی طرف بھی ایک اشارہ کرتا ہے۔قرآن مجید کا فرمان ہے'وما صبرك الا بالله'، تمھیں اللہ کے بغیر صبر حاصل نہیں ہوسکتا اور اسی طرح قرآن مجید کا فرمان ہے'استعينوا بالصبر والصلاة'، نماز اور صبر سے مدد لو۔اس میں اللہ اور صبر اور اللہ اور نماز کا ایک باہمی تعلق بنتا ہے۔اللہ اور صبر کا باہمی تعلق ہم نے اوپر جانا۔ یہاں ہم صرف نماز کے حوالے سے بات کریں گے۔نماز اصل میں خدا کے ساتھ زندہ اور قریبی تعلق کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے'واسجد واقترب'سجدہ کر اور قریب ہو جا۔اوپر ہم نماز اور صبر کی سرخی کے تحت یہ پڑھ آئے ہیں کہ نماز دراصل اللہ کی یاددہانی کا ذریعہ ہے۔ یہ یاددہانی اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے تعلق کو مضبوط کرتی ہے۔خدا کے ساتھ تعلق کی مضبوطی دراصل انسان میں حوصلہ و ہمت کو پیدا کرتی ہے، جس کی بنا پر آدمی بڑی سے بڑی مشکل اٹھانے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔

بے صبری اور خدا کی ناراضی

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے، اگر آدمی ان میں صبر نہ کرے تو خدا ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ایک گناہ کی طرح سمجھتے ہیں۔اس لیے بے صبری درحقیقت ایک گناہ بھی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آدمی شکر نہ کرے اور ناشکری کرنے لگے۔ بظاہر شکر گزاری کوئی فرض ونفل کی طرح کی چیز نہیں ہے۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں شکر گزاری اصل مطلوب ہے سارا دین اور ساری شریعت اصلاً اسی شکر گزاری ہی کے لیے آئے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہیں۔ جو آدمی اس شکر گزاری کا انکار کرتا ہے، وہ درحقیقت سارے دین کی ضرورت کا منکر ہے۔ ٹھیک ایسے ہی ہم یہ بات اوپر پڑھ چکے ہیں کہ شکر کا دوسرا رخ صبر ہے۔ چنانچہ جس طرح شکر مطلوب اصلی ہے ایسے ہی صبر مطلوب اصلی ہے۔

یہود کی اصل بیماری: بے صبری

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی من وسلویٰ پر بے صبری کے بیان کے فوراً بعد یہ فرمایا ہے کہ ہم نے ان پر ذلت و پستی اور کم ہمتی تھوپ دی۔ یہ بات اگرچہ ان کے مسلسل جرائم ہی کی بنا پر تھی مگر ان میں اصل جرم خدا کے ساتھ اپنے عہد نبھانے میں کوتاہی تھی جسے —— آپ جان چکے ہیں —— کہ ہم عدم صبر ہی سے تعبیر کریں گے۔ اس لیے کہ صبر اپنے موقف اپنے عقیدے اور حق پر قائم رہنے کا نام ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ قصہ یوں نقل ہوا ہے:

''اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، تو اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کرو کہ ہمارے لیے وہ چیزیں نکالے جنھیں زمین اگاتی ہے، سبزیاں، ککڑیاں، لہسن، مسور اور پیاز جیسی۔ کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) کیا تم اعلیٰ کو ادنیٰ سے بدلنا چاہتے ہو، (مصر جیسے) کسی شہر میں اترو گے تو وہ چیزیں تمھیں ملیں گی، جو تم طلب کرتے ہو، اور ان پر ذلت و پستی تھوپ دی گئی۔ اور وہ خدا کا غضب لے کر لوٹے...'' (البقرہ ۲: ۶۱)

اللہ تعالیٰ کا یہ غضب یہود پر اسی بے صبری کے رویے کی بنا پر اترا۔ یہود کی اس تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ میں جب انھیں 'استعینوا بالصبر و الصلوٰۃ' کہا گیا تو جس طرح یہ بات کم وبیش سب مفسرین نے لکھی ہے کہ یہود درحقیقت نماز ترک کر چکے تھے۔ مگر انھوں نے صبر کا نہیں لکھا، مگر حقیقت یہی ہے کہ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پوری طرح ثابت ہے کہ ہر قدم پر اصل میں انھوں نے بے صبری بھی دکھائی ہے۔ چنانچہ انھیں جب یہ حکم دیا گیا کہ نماز اور صبر سے مدد لو تو یہ بات یوں ہے کہ ان کی ایک کمزوری کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم نے اپنی لمبی تاریخ میں نماز قائم رکھی ہوتی اسے ضائع نہ کیا ہوتا اور اسی طرح ہمیشہ ہر حالت میں حق کو ڈھونڈتے اور اس پر قائم رہنے کی کوشش کرتے تو یقیناً تم آج بھی برگزیدہ امت ہوتے۔

چنانچہ اس رسول پر ایمان لانے میں ذرا بھی مشکل محسوس نہ کرتے اور ان دو شرائط کے پورا کر دینے کے بعد اصل میں تم وہ شرائط پوری کر دیتے جنھیں قرآن ہدایت کے لیے ضروری کہتا ہے۔ قرآن جسے تقویٰ بھی کہتا ہے اور یہ تقویٰ بس اسی حق پر قیام اور بندگی کا نام ہے۔ حق پر قیام کے معنی یہ ہیں کہ جو حق ہمارے پاس ہے اس پر قائم رہیں اور جو ہمیں غلطی لگی ہے اسے درست کر لیں۔ حق پر قائم رہنے کا یہی ایک طریقہ ہے اور اسی کو قرآن مجید صبر کہتا ہے۔

ایفائے عہد اور صبر

قرآن مجید میں ایفائے عہد کو صبر کا مصاحب نہیں بنایا گیا، لیکن حدیث میں یہ اکٹھے بیان ہوئے ہیں اور سیدنا عثمان نے بھی ایک موقع پر یہ جملہ بولا کہ میں اپنے عہد پر صابر ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کے ساتھ عہد کا عربی زبان میں

استعمال ہوتا ہے اور وہ اسی پہلو سے ہوتا ہے کہ آدمی اپنے وعدے پر قائم ہے۔ (ترمذی، رقم ۲۰۷۶)

ایفاے عہد بھی صبر ہی کی ایک شکل ہے۔ اس کے معنی بھی وہی ہیں، جو حق پر ثابت قدمی کے ہیں۔ صبر درحقیقت ثباتِ قدم ہی کا نام ہے۔ یہ ثبات قدم ہر اچھی چیز پر ہے۔ اسی کے تحت ایفاے عہد ہے۔ جب آدمی اپنے عہد پر قائم رہتا ہے تو درحقیقت وہ صابر ہے، اس لیے کہ بسا اوقات عہد کی پاس داری ایک مشکل بن کر سامنے آجاتی ہے۔

دین اسلام کا ایک بڑا حصہ دراصل عہد ہی ہے۔ اس جہاں میں دین کی بنیاد عہد الست پر اور اس عہد نبوت پر ہے جو سیدنا آدم سے اس وقت لیا گیا جب انھیں زمین پر بھیجا گیا۔ اسی طرح ایک وہ عہد امانت ہے جو تمام مخلوقات عالم کے سامنے پیش کیا گیا مگر بنی آدم کے سوا سب نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔ بنی نوع آدم کل قیامت کے دن انھی عہد معاہدوں کے لحاظ سے مسئول ہوں گے۔ عہد الست قرآن مجید میں یوں بیان ہوا ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؟قَالُوا: بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ : اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ. (الاعراف ۷:۱۷۲)

''یاد رکھو، جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے — ان کی پشتوں سے — ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا خود ان کے اوپر (پھر پوچھا) کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں تو ہمارا رب ہے، ہم اس کے گواہ ہیں۔ (ہم نے یہ اس لیے کیا) مبادا تم قیامت کو عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔''

عہد نبوت قرآن مجید میں یوں بیان ہوا ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا، فَاِمَّا يَأتِيَنَّكُمْ مِنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا، اُوْلٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ، هُم فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (البقرہ ۲:۳۸-۳۹)

''ہم نے کہا تم سب اتر جاؤ، اگر میری طرف سے کوئی ہدایت آئے، تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے وہی دوزخ والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

عہد امانت قرآن مجید میں یوں بیان ہوا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ. (۳۳:۷۲)

''ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمینوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ تین بڑے معاہدے ہیں، جن کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے، جن کے ہم محض انسان ہونے کے ناتے سے مکلّف ہیں۔ دو معاہدے ہمارے ساتھ براہ راست ہوئے ہیں، اور ایک یعنی عہد نبوت ہمارے باپ آدم علیہ السلام سے لیا گیا، جس کے ہم ان کی اولاد ہونے کے ناتے سے مکلّف ہیں۔

اگر ہم صابر بننا چاہیں تو ان عہود کی پاس داری ہم پر لازم ہے۔ عہد نبوت کے علاوہ دونوں عہد ہماری فطرت کا حصہ ہیں اور عہد نبوت ہمارے اوپر اپنے باپ کا قرض ہے۔ جس کے ادا کرنے کے ہم ذمہ دار ہیں۔ دین داری اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ہم ان کیے ہوئے عہد معاہدوں کی پاس داری نہ کریں۔ یہی دین پر قیام ہے۔

دعوت دین اور صبر

دعوت کے راستے میں صبر سے بڑھ کر کوئی زاد سفر نہیں ہے۔ اس کے بغیر دعوت کی دنیا میں ایک قدم چلنا بھی ممکن نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار یہی حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہے کہ آپ اللہ کے فیصلوں کا انتظار کریں۔ اپنی دعوت کو زیادہ سمجھتے ہوئے رک نہ جائیں۔

ہمارے دور میں بھی دعوت درحقیقت اسی صبر سے محروم ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس بے صبری کے سبب سے ہم جلد ہی فیصلہ کر گزرتے ہیں۔ ادھر کسی کے منہ سے اجنبی بات سنی، ادھر اسے کافر قرار دے دیا۔ بے صبری دعوت کے میدان کی ایسی آفات میں سے ایک ہے کہ یہ نہ صرف اس وقت دعوت کے پھیلنے میں رکاوٹ ہے، بلکہ فرقہ بندی کا سبب بھی ہے۔

قرآن مجید میں سیدنا یونس علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو صرف اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ وہ ان کی بات نہیں سن رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی گرفت فرمائی اور انھیں مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا یونس نے غیرت حق میں قدم اٹھایا تھا، بھلا اس میں اتنی سنگین بات کیا تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اتنی سخت سزا دی۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات بالبداہت واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دعوت کے ایک مورچہ پر مامور فرمایا تھا اور وہ اگلا حکم آنے سے پہلے ہی وہاں سے چل دیے تھے۔ یقیناً آج کے داعی کو اللہ تعالیٰ خود مامور نہیں فرماتا مگر اتنی بات تو ہے کہ ان رسولوں کی زندگی میں ہمارے لیے اسوہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر و استقامت اور آپ کی میدان دعوت میں تن دہی اور لوگوں کو مسلمان کر دینے کی لگن اور اس کے لیے ان تھک جدوجہد، اور اتنی ان تھک جدوجہد کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تم تو اپنے آپ کو ہلکان کر ڈالو گے۔

راہ دعوت میں لوگوں کے نہ سننے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے گریز کے ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا کہ 'خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ'، (اعراف ۷:۱۹۹) درگزر کرو، نیکی کا مشورہ جاری رکھو اور جو جاہل اور جذباتی قسم کے لوگ تمھارے مقابل میں آتے ہیں ان سے اعراض کرتے رہو۔ گویا صبر دراصل تین چیزوں سے تعبیر ہے:

۱۔ درگزر کرنا

۲۔ اپنے نیکی کے کام پر گامزن رہنا

۳۔ برے رویوں میں الجھنے اور ان پر کڑھتے رہنے کے بجائے ان سے گریز

دعوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صبر کو یوں بیان کیا ہے:

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ، اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (۳۱:۱۷)

''اے میرے بیٹے نماز کا اہتمام رکھ، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تمھیں پہنچے اس پر صبر کرو، بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں۔''

یہ حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں رکھ کر جاوداں بنا دیا ہے۔ اس میں انھوں نے بیٹے کو یہ نصیحت کی ہے کہ حق کی نصیحت کرنے اور برائی سے بچنے کے مشورہ دینے میں اور انذار کرنے کی وجہ سے لوگ تمھیں ستائیں گے۔ لوگوں کے ستانے پر تمھیں صبر کرنا ہوگا۔ اور پھر اپنے بیٹے کو انگیخت کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ کام ان کے ہیں جن کے حوصلے بلند اور ان کے عزم صمیم ہوتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایمان کی دعوت، بالخصوص اس وقت جب وہ تجدید و احیاے دین کی دعوت بن جائے تو وہ یقیناً دشمنیوں پر منتج ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ میں سب سے زیادہ ستایا گیا ہوں۔

جو لوگ دین و ملت کے احیا کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے دعوت کے میدان میں بے انتہا صبر کی ضرورت ہے۔ ان کے لیے یہ ایسا ہی ہے جیسے جینے والے کے لیے کھانا۔ ورنہ وہ دعوت کے میدان میں فساد ہی کا باعث بنیں گے۔ اس لیے کہ پھر وہ جلد بازی میں کفر و زندیقی کے فتوے لگائیں گے۔ منافق و ابلیس کے فقرے چست کریں گے۔ جیسا کہ ہم اس دور انحطاط میں دیکھتے ہیں۔

خلاصہ

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ صبر کے معنی دو ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی مشکلات میں حوصلہ و برداشت سے کام لے، وہ مایوس نہ ہو چیخے اور چلائے نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ہر حالت میں حق و انصاف پر قائم رہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ دینی رویے کا ایک جز ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ پورے دین پر قائم رہنے کی ایک جدوجہد کا نام ہے۔ اس لحاظ سے یہ شکر کے مقابل مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اور ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ یہ دراصل دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اچھے حالات میں نیکی کرتے رہنا اور تکبر و غرور وغیرہ سے بچنا شکر ہے۔ اور برے حالات میں نیکی کرتے رہنے اور مایوسی وغیرہ سے بچنا صبر ہے۔

اسی لیے قرآن کے بعض اشارات سے جیسا کہ ہم واضح کر آئے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے مطالبہ کو اگر دو لفظوں میں بیان کیا جائے تو وہ صبر و شکر ہے۔ جس نے یہ دونوں کام کر لیے وہ جنت کا حق دار ہے۔

اس خلاصہ کو اگر قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ ہے کہ آدمی ہر حالت میں اپنے رب کے رب ہونے پر راضی رہے۔ اور کبھی اس حق سے منحرف نہ ہو۔ کسی صحابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مجھے ایسی بات بتا دیں کہ پھر مجھے کسی اور سے پوچھنے کی حاجت نہ رہے۔ تو آپ نے ان کے سوال کی اہمیت ہی کے مطابق یہ جواب دیا کہ 'قل آمنت باللّٰہ ثم استقم'، کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر ہمیشہ قائم رہو۔

اسی بات کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھیں تو صبر کے معنی یہ ہیں کہ آدمی زندگی بھر اس موقف پر جما رہے کہ میں آزمایش میں ہوں اور مجھے ہر حالت میں اس آزمایش میں کامیاب ہونا ہے۔ گرم و سرد حالات میں مجھے وہی اعمال کرنے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہوں کہ میں اللہ کو اپنا رب مانتا اور اس کی منشا کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ مجھے اپنے ان بندوں میں شامل کرے جن سے وہ راضی ہے اور اپنی جنت میں داخل کرلے جس میں بس وہی جائیں گے جن سے وہ راضی ہوگا۔

یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً. فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ. (الفجر ۸۹: ۲۷۔۳۰)	''اے وہ جس کا دل (ہر حال میں) اپنے خدا سے مطمئن رہا، اب اپنے رب کی طرف چل، تو اس سے راضی وہ تم سے راضی، سو میرے بندوں میں شامل ہو جا، اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

اگلے باب میں ہم دیکھیں گے قرآن نے جنت کے حصول کے پہلو سے صبر کی کیا اہمیت بتائی ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عمار خان ناصر

''قادیانیوں سے تعلقات کی شرعی حیثیت''

مرتب: مولانا مشتاق احمد

ضخامت: ۴۸ صفحات

ناشر: ادارہ مرکزیہ دعوت وارشاد چنیوٹ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب میں احمدی تحریک کا ظہور ہوا اور مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت اور مہدویت کے دعوے سامنے آئے تو مولانا عبید اللہ سندھی طبقۂ علما میں غالباً واحد فرد تھے جنھوں نے اس تحریک کا تجزیہ سماجی سائنس کے اصولوں کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اس تحریک کے فروغ کا سبب عقائد اسلام کی دیدہ و دانستہ تحریف یا مسلمات سے انحراف کا کوئی شعوری فیصلہ نہیں ہے، بلکہ من جملہ دیگر اسباب کے پنجاب میں پیر پرستی کی مضبوط روایت اور ایک خاص سماجی صورت حال کو اس کے اصل سبب کی حیثیت حاصل ہے۔ چونکہ پنجاب کے متوسط طبقات میں انگریزی حکومت کے نظام کے تحت سرکاری ملازمتوں میں جانے کی خواہش موجود تھی اور مرزا صاحب نے انگریز دشمنی کی عمومی فضا میں وحی والہام کی سند پر انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیا تھا، اس لیے ایک نفسیاتی ضرورت کے تحت، نہ کہ شعوری اعتقادی انحراف کے باعث، عوام اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہونا شروع ہو گئے۔ مولانا کا خیال یہ تھا کہ اس تحریک کو ایک اعتقادی مسئلے کا رنگ دینا حکمت عملی کے لحاظ سے درست نہیں۔ وہ فرماتے تھے ''احمدیت ایک سماجی مظہر (Phenomenon) ہے۔ تحریک ختم نبوت جیسی تحریکیں نہ پہلے اس کا کچھ بگاڑ سکی ہیں اور نہ آیندہ بگاڑ سکیں گی، بلکہ ان سے اتحاد وربط اور قوت وصلابت پیدا ہو گی جیسا کہ اب تک ہوا ہے۔ احمدیت اور اس قسم کی دوسری علیحدگی پسند، رجعت پرست اور استعمار دوست مذہبی تحریکوں سے ایک ترقی پسند سماج اور سیکولر اور سوشلسٹ سیاسی نظام ہی کامیابی سے عہد برآ ہو سکے گا۔

اعتقادی ہتھیاروں سے یہ لڑائی نہیں لڑی جا سکتی۔'' (افادات وملفوظات، مرتبہ پروفیسر محمد سرور ۴۱۳۔۴۱۴)

تاہم حلقۂ علما میں بالعموم اس کے مخالف نقطۂ نظر کو پزیرائی حاصل ہوئی اور قادیانیت کو انگریز کا خود کاشتہ پودا باور کرتے ہوئے اس فرقۂ نوزائیدہ کی تکفیر کی گئی۔ علما کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں عالم اسلام کے بیش تر ممالک میں قانونی طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے، لیکن علما ہنوز مطمئن نہیں ہیں اور نظری طور پر یہ رائے رکھنے کے ساتھ ساتھ کہ قادیانی فقہی حکم کے مطابق عام سطح کے کافر نہیں، بلکہ 'زندیق' اور واجب القتل ہیں، اس بات کے بھی خواہش مند ہیں کہ سماجی سطح پر قادیانیوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے اور ان کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات روا نہ رکھے جائیں۔ زیر نظر کتابچہ میں اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی پر مبنی تحریریں شامل کی گئی ہیں جو مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مولانا مشتاق احمد اور جناب طاہر عبد الرزاق کے قلم سے نکلی ہیں۔

ایک موقف کے ابلاغ کے پہلو سے تو کتابچے کا پیغام واضح ہے، تاہم ایک سوچنے سمجھنے والے قاری کے ذہن میں اس موقف کے حوالے سے جو نہایت بنیادی سوالات پیدا ہو سکتے ہیں، ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ مثلاً کتابچے کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ: ''یہود ونصاریٰ اور ان کی مثل کافروں کے ساتھ اسلام نے جس نرمی، حسن اخلاق، ہمدردی وغم خواری اور کاروباری معاملات کی اجازت دی ہے، قادیانی اس کے مستحق نہیں۔... عام کافر سے صرف دلی دوستی کی ممانعت ہے، اور دنیوی معاملات میں اشتراک جائز ہے، لیکن قادیانیوں سے تو دنیوی معاملات میں بھی اشتراک جائز نہیں ہے''۔ (ص ۱۳) تاہم اس 'فرق' پر قرآن وسنت کے نصوص سے کوئی دلیل نہیں دی گئی۔ جو آیات واحادیث دلیل کے طور پر نقل کی گئی ہیں، ان میں، کسی امتیاز کے بغیر، مطلقاً غیر مسلموں سے دوستی قائم کرنے کی ممانعت کا ذکر ہے۔

صفحہ ۲ پر اس موقف کے حق میں یوں استدلال کیا گیا ہے کہ: ''ہر قادیانی اپنی آمدنی سے ایک معقول اور مقرر حصہ جماعت کے اشاعتی اور تبلیغی پروگرام کے لیے وقف کرتا ہے۔ اب جو مسلمان ان سے کاروبار کرے گا، ان سے کوئی چیز بنوائے گا یا خریدے گا تو اس کفر کی اشاعت میں اس مسلمان کا بھی حصہ ہو جائے گا جس کا گناہ ہونا بڑا واضح ہے''، لیکن اس اشکال سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا کہ اس صورت میں امت مسلمہ کے لیے تمام غیر مسلم ممالک یا گروہوں سے تجارتی معاملات کم وبیش ناممکن قرار پائیں گے، اس لیے کہ دنیا کے ہر غیر مسلم ملک یا گروہ کے وسائل کا کچھ نہ کچھ حصہ لازماً ایسے کاموں پر خرچ ہوتا ہے جو اسلامی احکام کی رو سے جواز کے دائرے میں نہیں آتے۔

اسی طرح صفحہ ۳۳ پر قادیانیت کا قلع قمع کرنے کے لیے یہ تجویز دی گئی ہے کہ اگر اہل اسلام یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ کسی قادیانی دکان دار سے سودا سلف نہیں لیں گے، کسی قادیانی تاجر کو اپنی ایسوسی ایشن کا ممبر نہیں بنائیں گے، دفتروں، اسکولوں اور کالجوں میں اور ہر معاشرتی سطح پر قادیانیوں کا مکمل بائیکاٹ کریں گے تو ''آپ دیکھیں گے کہ قادیانیت صرف چند ہفتوں میں دم توڑ جائے گی، ہزاروں قادیانیوں کو اپنے جرم کا احساس ہوگا اور یہ احساس انھیں حقیقت سوچنے پر مجبور کرے گا۔'' قطع نظر

اس سوال سے کہ ''حقیقت سوچنے پر مجبور کرنے'' کا یہ انداز حکمت دین کے مسلمات کے کس حد تک مطابق ہے، مذکورہ مفروضے کو اس درجے میں حتمی اور قطعی خیال کر لیا گیا ہے کہ کسی دوسرے احتمال کو زیر بحث لانے کی سرے سے ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ نتیجے کے طور پر یہ سوال تشنۂ جواب ہی رہ جاتا ہے کہ اگر اس رویے سے قادیانیوں تک حق کا پیغام پہنچنے کے امکانات بالکل مسدود ہو جائیں تو ایسی صورت میں تبلیغ حق کا فریضہ کیسے انجام دیا جائے گا؟

کتابچے میں، غالباً سنجیدہ تحریروں کی کمی کی تلافی کے لیے جذباتی نوعیت کے مواد کو بھی جگہ دینا پسند کیا گیا ہے۔ قادیانیت کے خلاف عمومی طور پر تنفر کی جو فضا پائی جاتی ہے، اس میں علمی وفکری سوالات اور حکمت عملی سے متعلق امور پر سنجیدہ بحث کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اور ناقص اور تیسرے درجے کے استدلالات کو بھی ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم امید کرتے ہیں کہ آیندہ ایڈیشن میں مذکورہ علمی نقائص کے ازالے کی طرف توجہ دی جائے گی۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مرتب: معظم صفدر

اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۴ء

قرآنیات

جنوری	آل عمران	(۳:۱۔۶)	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۵
فروری	〃	(۳:۷۔۹)	〃	〃	۵
مارچ	〃	(۳:۱۰۔۱۳)	〃	〃	۳
اپریل	〃	(۳:۱۴۔۱۷)	〃	〃	۵
مئی	〃	(۳:۱۸۔۲۰)	〃	〃	۷
جولائی	〃	(۳:۲۱۔۲۵)	〃	〃	۵
اگست	〃	(۳:۲۶۔۳۲)	〃	〃	۹
ستمبر	〃	(۳:۳۳۔۳۷)	〃	〃	۹
اکتوبر	〃	(۳:۳۸۔۴۱)	〃	〃	۱۳
نومبر	〃	(۳:۴۲۔۴۴)	〃	〃	۹
دسمبر	〃	(۳:۴۵۔۵۱)	〃	〃	۱۱

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

معارف نبوی

جنوری	اوقات نماز میں تقدیم و تاخیر	زاویۂ فراہی	صفحہ	۷

جنوری	تقدیر پر ایمان نہ لانے کی سزا	طالب محسن	صفحہ	۹
فروری	بو والی سبزیاں	زاویۂ فراہی	〃	۹
〃	اہل قدر کی دنیوی سزا	طالب محسن	〃	۱۲
اپریل	گرما اور سرما میں ظہر کی نماز کے اوقات	زاویۂ فراہی	〃	۹
〃	اہل کفر کے بچوں کا انجام	طالب محسن	〃	۱۱
مئی	حضرت آدم کا حضرت داؤد کے لیے عمر کا ایثار	〃	〃	۱۱
جولائی	آدم کی جنتی اور جہنمی اولاد	〃	〃	۹
اگست	ایک صحابی کی اندیشہ نا کی۔عہد الست کا مقام	طالب محن	〃	۱۵
ستمبر	شرح موطا امام مالک	ساجد حمید	〃	۱۳
اکتوبر	احرام باندھتے وقت خوشبو کا استعمال	معز امجد	〃	۱۷
〃	ہمارا دین	طالب محسن	〃	۲۰
〃	نماز کے اوقات	ساجد حمید	〃	۳۷
نومبر	نماز کی پہلی صف میں شمولیت کی فضیلت	معز امجد	〃	۱۱
〃	ہمارا دین	طالب محسن	〃	۱۴
دسمبر	ایمان اور جنت	طالب محسن	〃	۱۷
〃	شرح موطا امام مالک۔نماز کے اوقات	ساجد حمید	〃	۲۳

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دین و دانش

جنوری	قانون عبادات (۷)	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۱۳
فروری	قانون عبادات (۸)	〃	〃	۱۷
〃	ارکان حج کی حقیقت	الطاف احمد اعظمی	〃	۲۲
مارچ	اسلام اور موسیقی	منظور الحسن	〃	۷
اپریل	قانون عبادات (۹)	جاوید احمد غامدی	〃	۱۵
مئی	قانون عبادات (۱۰)	〃	〃	۱۹

جولائی	قانون عبادات (۱۱)	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۱۱
اگست	قانون عبادات (۱۲)	〃	〃	۲۱
〃	غیرت کا قتل	طالب محسن	〃	۳۹
ستمبر	قانون عبادات (۱۳)	جاوید احمد غامدی	〃	۲۷
اکتوبر	قانون عبادات (۱۴)	〃	〃	۴۳
نومبر	قانون عبادات (۱۵)	〃	〃	۲۳
〃	صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟ (۱)	ساجد حمید	〃	۳۱
دسمبر	قانون عبادات (۱۶)	جاوید احمد غامدی	〃	۳۳

شذرات

جنوری	اخلاقی جارحیت	منظور الحسن	صفحہ	۲
فروری	قربانی	〃	〃	۲
مارچ	اسلام اور موسیقی ـــــ خصوصی اشاعت	〃	〃	۲
اپریل	تقلید اور اجتہاد	〃	〃	۲
	ایک ضروری وضاحت	〃	〃	۴
مئی	زکوٰۃ پر تملیک کی شرط	〃	〃	۲
جون	خیال و خامہ ـــــ خصوصی اشاعت	〃	〃	۲
جولائی	دہشت گردی ـــــ علما کی اصل ذمہ داری	〃	〃	۲
اگست	استحکام پاکستان	〃	〃	۲
〃	ہندوستانی انتخابات اور پاکستان	ریحان احمد یوسفی	〃	۶
ستمبر	اہل سیاست اور سیاسی استحکام	منظور الحسن	〃	۲
〃	فرد اور اجتماع کی نجات ـــــ کرنے کا اصل کام	ریحان احمد یوسفی	〃	۵
اکتوبر	روزے کے اثرات	منظور الحسن	〃	۲
〃	رمضان کا مہینا ـــــ حاصل کیا کرنا ہے؟	ریحان احمد یوسفی	〃	۸

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نومبر	تراویح کی نماز	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۲
ً	لیلۃ القدر	منظور الحسن	ً	۶
دسمبر	یوم اقبال پر ''مدیر اشراق'' کا خطاب	جاوید احمد غامدی	ً	۲
ً	یہ رقت آمیز اجتماعی دعائیں	ریحان احمد یوسفی	ً	۶

حالات و وقائع

جنوری	مسئلۂ فلسطین	ڈاکٹر محمد فاروق خان	صفحہ	۲۳
ً	امام مالک بن انس	محمد رفیع مفتی	ً	۴۳
ً	عروہ بن زبیر	محمد وسیم اختر مفتی	ً	۴۸
فروری	ہمارا اخلاقی بحران	ریحان احمد یوسفی	ً	۴۳
ً	امام احمد بن حنبل	محمد رفیع مفتی	ً	۶۰
اپریل	تہذیبوں کا تصادم: حیا کے میدان میں	ریحان احمد یوسفی	ً	۲۱
ً	امام محمد بن اسماعیل بخاری	محمد رفیع مفتی	ً	۳۸
مئی	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ ـــــ تنقیدی آرا کا جائزہ	عمار خان ناصر	ً	۲۹
ً	امام مسلم بن حجاج	محمد رفیع مفتی	ً	۵۹
جولائی	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ (۲)	عمار خان ناصر	ً	۲۱
ستمبر	مصعب اسکول سسٹم کے طلبہ کی شان دار کامیابی	نعیم احمد بلوچ	ً	۴۵
نومبر	خلافت راشدہ کا تعارف	طالب محسن	ً	۴۳
ً	محدثین	محمد رفیع مفتی	ً	۵۳
ً	فکری قیادت اور اس کے کرنے کے کام	ریحان احمد یوسفی	ً	۶۳

نقد و نظر

اگست	''تصویر کا مسئلہ'' ـــــ محدث کے اعتراضات کا جائزہ	محمد رفیع مفتی	صفحہ	۴۳

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نقطۂ نظر

دسمبر	صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟ (۲)	ساجد حمید	صفحہ	۳۹

اصلاح و دعوت

جنوری	متفرق مضامین	امین احسن اصلاحی ۔ طالب محسن ۔ خورشید احمد ندیم ۔ محمد وسیم اختر مفتی ۔	صفحہ	۵۳

مکاتیب

اکتوبر	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ	محمد عزیر بھور، آفتاب عروج/عمار خان ناصر	صفحہ	۵۱

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وفیات

فروری	جناب ماجد خاور کی وفات	محمد احسن تہامی	صفحہ	۶۵

تبصرۂ کتب

جنوری	''حیات رسول امی''	مقبول الرحیم مفتی	صفحہ	۶۵
فروری	''قبول حق کے بعد''	معظم صفدر	؍؍	۶۷
اپریل	''عروج و زوال کا قانون اور پاکستان''	منظور الحسن	؍؍	۴۳
ستمبر	''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو''	ریحان احمد یوسفی	؍؍	۴۷
نومبر	''تذکار بگویہ''	نعیم احمد بلوچ	؍؍	۶۹
دسمبر	''قادیانیوں سے تعلقات کی شرعی حیثیت''	عمار خان ناصر	؍؍	۶۳

ادبیات

جنوری	غزل	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۶۹
فروری	غزل	〃	〃	۷۱
مارچ	غزل	〃	〃	۱۰۷
اپریل	غزل	〃	〃	۵۳
مئی	غزل	〃	〃	۶۲
جون	خیال و خامہ	〃	〃	۳
〃	منظومات	〃	〃	۹
〃	دریا بہ حباب اندر	〃	〃	۷۵
〃	سبزۂ نورس	〃	〃	۱۱۷
اگست	سورۂ ماعون کی منظوم ترجمانی	مرزا آصف رسول	〃	۵۴

اشاریہ

دسمبر	اشاریہ ''اشراق'' ۲۰۰۴ء	معظم صفدر	صفحہ	۶۷

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org